آتَیْنٰہُ الْحِکْمَۃَ وَفَصْلَ

الخطاب

پروفیسر محمد سلیمان اشرف

۱۹۱۴ء کی یادگار تقریر

مع

خطبہ صدارت: خان بہادر سر رحیم بخش

۲۸واں سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس راولپنڈی

ادارۂ پاکستان شناسی لاہور

الخطاب

MUSLIM EDUCATIONAL CONFER
SULTAN JAHAN MANZIL, ALIGARH

۱۹۱۴ء کی یادگار تقریر

مع

خطبہ صدارت

خان بہادر سر رحیم بخش

۲۸واں سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس راولپنڈی

پروفیسر محمد سلیمان اشرف

کتاب : الخطاب
تقریر : مولانا محمد سلیمان اشرف
خطبۂ صدارت : خان بہادر سر رحیم بخش
بار اوّل : علی گڑھ، ۱۹۱۵ء
طبع جدید : اکتوبر ۲۰۱۶ء
تقدیم و تحشیہ : ظہور الدین امرتسری
ترجمہ فارسی اشعار : ڈاکٹر معین نظامی
کمپوزنگ : محمد نعیم اصغر ۰۳۳۳-۴۴۷۴۹۵۹
ضخامت : ۱۸۸ صفحات
تعداد : گیارہ سو
مطبع : ایوب پرنٹنگ پریس، لاہور
ناشر : ادارۂ پاکستان شناسی، ۴۳۰/۲ سوڈھیوال کالونی، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۰۰
فون: ۰۳۲۲-۴۰۰۵۹۵۴
ہدیہ : ۳۵۰ (تین صد پچاس روپے)

ڈسٹری بیوٹرز

خان بک کمپنی: ۳ کورٹ اسٹریٹ، لوئر مال، لاہور فون: ۰۴۲-۳۷۳۵۳۶۳
ادبستان: ۶-سی دربار مارکیٹ، لاہور فون: ۰۳۰۰-۴۱۴۰۲۰۷
بیکن بکس: گلگشت، ملتان فون: ۰۶۱-۶۵۲۰۷۹۰-۷۹۱
دار العلوم نعیمیہ: فیڈرل بی ایریا، دستگیر بلاک نمبر ۱۵، کراچی فون: ۰۲۱-۳۶۳۲۴۳۳۶

پہلی وحی اور علم

صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے علم و تعلیم پر ہر مذہب سے زیادہ زور دیا ہے۔ حتیٰ کہ قرآن مجید کی پہلی وحی کا سب سے پہلا لفظ "اِقْــرَأْ" ہے، جس کے معنی ہیں پڑھو۔ یعنی قرآن مجید سب سے پہلے پڑھنے ہی کا حکم دیتا ہے۔ پڑھنے کے علاوہ لکھنے کو بھی بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے، چناں چہ اسی اولین وحی میں اللہ کے مقدس اوصاف کا علم عطا فرماتے ہوئے کہتا ہے:

اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ پڑھو، اور تمہارا رب بے حد کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ علم عطا فرمایا ہے۔

قلم اور لکھنے کی راہ سے علم کی اشاعت اسلام کی نگاہ میں اس قدر اہم ہے کہ اس کو اللہ کا بہت بڑا عطیہ فرماتا ہے۔ اتنا بڑا عطیہ کہ اولین وحی میں تخلیق انسانی کے ذکر کے بعد اسی عطیہ کو بیان کرتا ہے۔ اب اندازہ لگاؤ اس کی اہمیت کا! یوں تو اللہ کے لامحدود عطیے ہیں لیکن قلم اور کتابت کی راہ سے علم عطا فرمانا وہ عطیۂ خاص ہے کہ اولین وحی میں صرف تین عطائے الٰہی کا ذکر ہے جن میں ایک یہ ہے۔

ان تین عطایا کا ذکر بہ ترتیب ذیل ہے:

۱ انسان کو علق سے پیدا فرمایا۔ (خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ)
۲ قلم کے ذریعہ علم عطا فرمایا۔ (عَلَّمَ بِالْقَلَمِ)
۳ اور ذرائع سے بھی علم دیا۔ (عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ)

(جواہر البیان فی تفسیر القرآن، جلد دوم: علامہ عزیز الحق کوثر ندوی، مطبوعہ بنارس (یوپی) بھارت، ۲۰۰۹ء)

تحریک آزادی میں اسلامیان ہند
کے لیے جدید تعلیمی استعداد کی اہمیت
اور علماءِ کرام کا کردار

سب سے اوّل ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں پر سے اُن خیالات کا اثر دور ہو جو اُن کو جدید تعلیم میں ترقی کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ یہ کام فی الحقیقت ہماری قوم کے علما کا ہے کیوں کہ وہی مسلمانوں کو سمجھا سکتے ہیں کہ یہ عین مذہب کا منشا ہے کہ ہم علمی اور اخلاقی میدان میں ترقی کریں۔ اسلام نے علم کی ضرورت اور وقعت کو جس قدر سمجھایا ہے کسی ملت نے ایسا نہیں کیا۔ کلام پاک میں ارشاد ہے۔ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ''(اور اے پیغمبر) دعا کرتے رہا کرو کہ اے میرے پروردگار مجھے اور زیادہ علم نصیب کرنا''۔ دولت کے لیے نہیں کی، اولاد کے لیے نہیں، ملک کے لیے نہیں، دنیاوی سروسامان کے لیے نہیں، ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دعا اگر کی تو زیادتی علم کے لیے۔ اب یہ ہمارے علما کا کام ہے کہ وہ یہاں کے مسلمانوں کو سمجھائیں کہ جدید تعلیم میں اعلیٰ مدارج حاصل کرنا عین دین کا منشا ہے۔

(رپورٹ متعلق اٹھائیسواں سالانہ اجلاس ۱۹۱۴ء۔ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ راولپنڈی، صفحہ ۱۲۷)

مولانا زبیری کے دیباچہ کی چند سطور

اٹھارھویں صدی کے آخر سے اُنیسویں صدی کے چوتھائی سے زیادہ عرصہ تک مسلسل چالیس بیالیس برس کی مدت میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے مسلمانانِ ہندوستان میں جس استقلال و استقامت کے ساتھ تعلیم منادی کا فرض انجام دیا ہے اور جس طرح قوم کے اندر علوم جدیدہ کی اشاعت و تبلیغ میں پانی کی طرح روپیہ بہایا ہے جو بلاشبہ یہ ایک بیش بہا قومی خدمت ہے۔ جس زمانہ میں اور جن حالات کے اندر کانفرنس قایم ہوئی اس وقت دنیا متحرک تھی اور مسلمان ساکن و جامد۔ قومی تعلیم کے لحاظ سے وہ ایک تاریک زمانہ تھا جس کے اندھیرے میں ہماری تمام حسیاتِ ملی مُردہ ہو رہی تھیں۔ اس مجلس کے میر مجلسوں نے دورِ حاضرہ کی ضرورت اور حقائق حالات کی بنا پر اپنے زبردست خطبوں کے ذریعہ سے قوم کو تعلیم پر متوجہ کرنے کی اہم کوشش کی۔

دیباچہ: خطباتِ عالیہ، حصہ اوّل
مسلم یونی ورسٹی پریس علی گڑھ، ۱۹۲۷ء

ایک اور اقتباس

ہر زبان کے خطیبوں کے خیالات اور افکار ذہنی و دماغی کا ذخیرہ اُس زبان کا بیش بہا سرمایہ متصور ہوتا ہے جس زبان میں کہ وہ ادا کیے جاتے ہیں۔ جو اپنے زمانہ کے لحاظ سے راہِ عمل اور مستقبل کے لیے قوم کی ہمت اور جوش کا افسانہ تاریخی صفحۂ عالم پر اُن کے کارنامۂ عمل کی زندہ یادگار بن کر چمکتا ہے۔ موجودہ نسلیں اُن کے ساتھ خواہ کچھ ہی سلوک کیوں نہ کریں، لیکن یقیناً آنے والی نسلیں اُس کو شوق سے پڑھتی ہیں اور اپنے ماحول کے مطابق گزرے ہوئے حالات کے لحاظ سے استخراجِ نتائج میں اپنے پیش رووں کے ٹھوس اور عمیق افکار سے مدد لے کر اُن کی دماغی کاوشوں کا (خواہ وہ ملکی پالیٹکس سے تعلق رکھتی ہوں خواہ تعلیماتِ عامہ یا بہبودیٔ قوم کے دیگر امور مہمات سے) غرض ہر طرح سے خیر مقدم کرنے میں پیش قدمی کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ مہذب اور تعلیم یافتہ دنیا طرح طرح سے اپنی قوم کے دانشوروں کے خیالات کی اشاعت کرتی رہتی ہیں؛ گویا اس طریقہ سے گزرے ہوئے لوگوں کا پیغام آنے والی نسلوں کو پہنچا کر ان میں عمدہ تعلیم، بہتر تربیت، پاکیزہ اخلاق کی تخم ریزی کر کے اُن کی نشوونما میں مصروف نظر آتی ہے۔

الفہرس

عکسی خزانہ نوادر

دیباچہ

مولانا سید سلیمان اشرف کا یہ خصوصی خطاب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اٹھائیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۱۴ء بمقام راولپنڈی ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت مولوی حاجی سر رحیم بخش[1] مرحوم نے کی۔ یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ ایجوکیشنل کے تمام اجلاس ہر سال باقاعدہ متحدہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر منعقد ہوتے رہے، جن میں پورے ہندوستان سے مختلف علاقوں میں رہنے والے

---

[1] رحیم بخش، مولوی سر: (تقریباً ۱۸۶۱–۴ر مئی ۱۹۳۵ء): وطن ٹھکا میراں جی (ضلع کرنال)۔ نارمل اسکول سے تعلیم حاصل کی۔ شہر انبالہ میں چندرہ روپے ماہوار پر مدرس مقرر ہوئے ترقی کر کے چیفس کالج لاہور میں ۱۲۵ روپے مشاہرے تک پہونچے۔ نواب صادق محمد خاں رابع والئی بہاولپور چیفس کالج میں آئے، تو مولوی صاحب ان کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ چنانچہ وہ انھیں بہاولپور لے گئے جہاں ۱۸۹۷ء تک ۴۰۰ روپے ماہوار تنخواہ ہوئی۔ پھر کسی معاملے میں اختلاف رائے کی بنا پر مولوی رحیم بخش صاحب نے استعفا دے دیا۔ نواب صاحب نے پچاس روپے ماہوار وظیفہ تاحیات مقرر کر دیا۔
۱۹۰۳ء میں نواب بہاول خاں پنجم نے پھر بہاول پور بلا لیا، جہاں مشیر امور خارجہ مقرر ہوئے۔ نواب موصوف نے حج سے واپسی پر انتقال کیا تو ان کے جانشین کی کم سنی میں مجلس نیابت (کونسل آف ریجنسی) بنی جس کے صدر مولوی صاحب مقرر ہوئے۔ اپریل ۱۹۲۳ء میں ۲۰،۰۰۰ روپے نقد انعام اور ۱۰،۰۰۰ سالانہ وظیفے پر ریاست کی خدمات سے سبکدوش ہوئے۔ تمام تعمیری، اصلاحی، تعلیمی اور مذہبی اداروں سے انھیں وابستگی تھی۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ندوۃ العلماء، راجپوت کانفرنس سب کی صدارت کی۔ ان کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ مرکزی انجمن تبلیغ اسلام کی بنیاد استوار کی۔ انجمن اصل میں میر غلام بھیک نیرنگ، کنور عبدالوہاب خاں اور مولوی رحیم بخش ہی کی ممنون احسان تھی۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کے لیے یک مشت ۱۰،۰۰۰ روپے جیب سے دیے۔ ہزاروں روپے مساکین کو بھی دیتے تھے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد حکومت پنجاب نے انھیں بہ اصرار مجلس وضع قانون کا رکن نامزد کیا۔ (اردو جامع انسائیکلو پیڈیا، جلد اول۔ ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۸۷ء، ص ۶۶۲)

اور قومی ترقی کے خواہش مند افراد شرکت کرتے۔ کانفرنس کے شاندار اجلاس پشاور اور راولپنڈی سے ڈھاکہ اور رنگون تک اور دلی سے کراچی، بمبئی اور مدراس تک منعقد ہوئے جن سے ملک کے طول و عرض میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ کل ہند سطح پہ مذکورہ کانفرنس کب اور کیوں کر قائم ہوئی، کانفرنس کے اغراض و مقاصد کیا تھے؟ تفصیلاً بیان کرتے ہیں کہ نسلِ نو آگاہ ہو سکے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قیام اور اغراض و مقاصد:

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام (جسے بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا نام دیا گیا، مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے قیام ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کے گیارہ سال سات مہینے بعد) دسمبر ۱۸۸۶ء میں عمل میں آیا۔ اس ادارے کے بنیادی مقاصد میں علی گڑھ کے علاوہ دیگر علاقوں کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات پر غور و خوض کرنا اور ان میں مغربی تعلیم کے حصول کا شوق اور اپنی تعلیمی پس ماندگی[1] کو دور کرنے کا شعور پیدا کرنا شامل تھے۔

سیّد الطاف علی بریلوی (م: ۲۴ ر ستمبر ۱۹۸۶ء) علی گڑھ یونی ورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے۔ وہ سرسیّد کی انجمن آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے پندرہ سال (۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۰ء تک) وابستہ رہے۔ وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> 'سرسید علیہ الرحمۃ کی زندگی کے اہم کاموں میں سے ایک عظیم الشان کارنامہ 'مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'[2] کا بھی ہے، جس کو انھوں نے

---

[1] حصہ ہندوستان میں مسلمان تعلیمی لحاظ سے کس قدر پس ماندہ تھے۔ مولانا سلیمان اشرف نے اس پر ہندو اور مسلم تعلیمی تناسب کا ایک جائزہ پیش کیا ہے۔ (تفصیلی مطالعہ کے لیے دیکھیے: 'النور' علی گڑھ، ۱۹۲۱ء اور محمد صدیق: 'پروفیسر مولوی حاکم علی'۔ لاہور، جنوری ۱۹۸۳ء)۔

[2] 'دارالعلوم علی گڑھ میں کانفرنس کے صدر دفتر کی عظیم الشان ذاتی عمارت سلطان جہاں منزل، اس کا خوشنما ہال اور نادر کتاب خانہ زمانۂ دراز سے مرجع خلائق اور صاحبانِ علم و عمل کا ملجا و ماوا رہا۔ بڑے بڑے قومی اجتماعات ہوتے رہے، اور ترقی و فلاحِ ملی کی جدوجہد جاری و ساری رہی'۔ (آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی صد سالہ تاریخی ڈائری ۱۸۸۶ء تا جون ۱۹۸۶ء، طبع کراچی، ص ۸)

علی گڑھ[1] کالج کھولنے کے گیارہ سال بعد ۲۷ ر دسمبر ۱۸۸۶ء کو قائم کیا۔ گزشتہ پینسٹھ سال سے اس کانفرنس کے مقاصد کی تشریح اور ان کا اعلان مسلسل طور پر جس بلند آہنگی سے ہوتا رہا ہے اس سے مسلم قوم کا ہر فرد واقف ہے۔

اب سے ساٹھ پینسٹھ سال قبل مسلمانوں میں ایک دوسرے کے حال سے بے خبری کا یہ عالم تھا کہ ایک صوبہ تو در کنار، ایک شہر کے مسلمان بھی قومی اغراض اور قومی بھلائی کی خاطر ایک جگہ جمع ہونا اور قومی اصلاح و ترقی کی تدابیر پر کچھ سوچنا اور غور کرنا نہ جانتے تھے۔ ہندوستان کے دوسرے باشندے زمانہ کی رو کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ اور مسلمان تعلیمی، اخلاقی، مادّی غرض ہر قسم کے ترقی بخش وسائل سے ناآشنائے محض تھے۔ یہ وہ حالات تھے جن سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں تعلیمی بیداری اور سیاسی شعور پیدا کرنے کے لیے یہ قومی ادارہ وجود میں لایا گیا۔ اور بے شبہ آج کی تمام حسیاتِ ذہنی اور انقلاب خیالات اس کانفرنس ہی کے رہین

---

[1] 'علی گڑھ ایک پیارا نام ہے۔ سرسید ایک حدیث شریف کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''ہمارے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مشہور یہ قول ہے کہ انا مدینۃ العلم وعلی بابہا۔ پس یہ پہلا مدرسہ ہم مسلمانوں کا، جو در حقیقت علم کا دروازہ ہوگا، علی گڑھ ہی میں ہونا چاہیے'۔ (اقتباس از کمیٹی خزینۃ البضاعۃ، اجلاس ہم منعقدہ ۲ ۱۸۷ء، بحوالہ ایم۔ وائی انصاری، پروفیسر: 'سرسید اور فنِ تعمیر' مشمولہ: مقالاتِ سرسیّد صدی (مارچ ۱۹۹۸ء) کراچی۔ سرسید یونی ورسٹی پریس، ص ۵۰)

نوٹ: سرسیّد، کمیٹی 'خزینۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ المسلمین' کے لائف سیکرٹری تھے۔ اس کمیٹی کا دفتر علی گڑھ کالج کے قیام تک بنارس میں رہا چوں کہ سرسیّد بسلسلہ ملازمت (۱۸۷۰ء) بنارس میں ہی مقیم تھے (حیاتِ جاوید، حصہ اول، طبع ثانی، ص ۱۳۰)۔ سرسیّد نے اپنے مشن کی تکمیل اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کو عام کرنے کی غرض سے مذکورہ کمیٹی قائم کی تھی۔ کمیٹی کا مقصد مجوزہ کالج (اینگلو اورینٹل کالج) کے قیام کے لیے چندہ جمع کرنا تھا۔ کمیٹی نے سرسید کو کالج کے لیے فنڈ (چندہ، عطیات) جمع کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ (ایچ۔ بی۔ خان، ڈاکٹر: 'تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان وقرارداد مقاصد'۔ الحمد اکادمی، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۳۵)

منت ہیں جس نے اجتماع ملی پر سب سے پہلے آواز بلند کی۔[1] جلسوں کے آئین و

---

1. اس حقیقت سے انکار نہیں چناں چہ مولانا سلیمان اشرف نے بھی ایک موقع پر علی گڑھ کے ہی فیض یافتگان (علوم مغربیہ) جنھوں نے مسلمانوں کے حقوق کے لیے اکثر آواز بلند کی، اور مستقبل میں ملک وملت کی راہنمائی کا فریضہ انجام دیا، کا تذکرہ کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

'یہ واقعہ ہے، حقیقت ہے اس سے انکار کرنا سورج کی روشنی سے انکار کرنا ہے کہ ہندوستانیوں کا حکومت کے سامنے آنا اپنے مطالبات کو موثر پیرایہ میں پیش کرنا ثبات وقرار سے اپنے حقوق کے طلب میں مسلسل سرگرم کار رہنا اور پھر اپنی کامیابی کے لیے ایثار وقربانی سے دریغ نہ کرنا یہ سب تعلیم انگریزی کا ثمرہ ہے۔ آئین سلطنت پر جنھوں نے نکتہ چینی کی ہے وہ انگریزی خواں ہیں حکومت خود اختیاری کا جنھوں نے نعرہ بلند کیا ہے وہ انگریزی خواں ہیں غلامی کی ذلتوں کا جس نے احساس پیدا کیا ہے وہ انگریزی خواں ہیں۔...... طرفگی یہ کہ سارے انگریزی خواں اُنھیں کالجوں کے تعلیم یافتہ اور سندیاب ہیں جن کا الحاق گورنمنٹ کی یونی ورسٹیوں سے ہے سرکاری کالج یا امدادی کالج میں تعلیم پانے سے اُن کے جذبات قومی نہ فنا ہوئے نہ مٹے۔ (النور:۱۹۳)

...... مذکورہ طبقہ کو انگریز کی غلامی کا طعنہ دینے والے اراکین خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء ہند کے قائدین (بالخصوص مفتیانِ سیاسی) نے جب تحریک ترک موالات (۱۹۲۰ء) کے دوران آزاد قومی یونی ورسٹی کے قیام کی آڑ میں مسلمانوں کے تعلیمی اداروں جیسے اسلامیہ کالج لاہور کو نشانہ بنایا، اور اسلامیانِ ہند کی عظیم درس گاہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی پر حملہ آور ہوئے (حال آں کہ بقول ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد: 'خلافت کا کام کرنے والوں میں ۴/۳ علی گڑھ کے طلبا تھے۔ اور علی گڑھ ہی ان کی فیکٹری تھی اگر اس کو ہی تباہ کر دیا جائے تو کام کرنے والے کہاں سے ملیں گے') تو مولانا سلیمان اشرف نے اُس وقت حقیقت حال سے پردہ اُٹھاتے ہوئے ان حضرات کو خبردار کیا کہ...... 'اس وقت (یعنی تحریک خلافت وترک موالات کے دوران) علماء سیاسی میں جو خروش وجوش ہے وہ بھی نتیجہ انھیں انگریزی خوانوں کا ہے انھیں کے ہاتھوں نے انھیں جھنجوڑا، جب ان کی آنکھیں کھلیں انھیں کے ہاتھوں نے سہارا دیا جب ان کے قدم اُٹھے انھیں کی آوازوں نے ان کی زبانیں کھولیں جب یہ بولنے لگے...... اس وقت بھی اگر انگریزی خواں جماعت ان تحریکات سے الگ ہو جائے تو سارے جمعیت العلماء کے فضلائے یگانہ اپنی اپنی درسگاہوں میں ہوں گے یا منبر ومحراب میں کسی یتیم خانہ یا مدرسہ یا مسجد یا انجمن اسلامیہ کا وعظ فرما کر آخر میں تحریک چندہ فرماتے ہوں گے۔ وزرائے انگلستان کے آرا پر تنقید اور سیاست ہند پر مباحثہ کسی کے وہم میں بھی نہ آئے گا۔' (وہی حوالہ:۱۹۳)

ضوابط اور مطالبات قومی پر بحث ومباحثہ کے طریقے سکھائے، اور اعلیٰ خیالات کا ایک ایسا بلند مینار تیار کیا جس پر چڑھ کر قوم نے اپنی حالت کو دیکھا، اور تباہ کن راہوں کو ترک کر کے ترقی پذیر شاہراہوں پر گامزن ہوئی۔'[1]

آگے چل کر سید بریلوی (علیگ) مرحوم رقمطراز ہیں:-

'کانفرنس نے اپنے مقصد اور نصب العین کے مطابق مسلمانوں میں ہر ممکن اور مناسب طریقہ سے صحیح تعلیم کو رائج کیا نہایت استقلال کے ساتھ تصنیف وتالیف وتراجم کے ذریعہ اسلامی لٹریچر اور تاریخ کی حفاظت، اردو کی ترویج واشاعت کے ذرائع کی بہم رسانی، معلومات تعلیمی کے لیے اعداد وشمار کی ترتیب وتدوین، اصلاح تمدن کے وسائل کی فراہمی، ہزارہا ضرورت مند طلبا کو لاکھوں روپے وظائف، مدارس وانجمن ہائے اسلامی کا قیام، اور اُن کی ہر قسم کی امداد کے علاوہ سب سے بڑی خدمت مسلم یونی ورسٹی کو وجود میں لانے کی انجام دی۔ اسی طرح مسلم گرلس کالج علی گڑھ، ڈھاکہ یونی ورسٹی، انجمن ترقی اردو اور مسلم لیگ[2] جیسے قابل فخر مسلمانوں کے قومی ادارے کانفرنس ہی کی تحریک وتشویق سے معرض وجود میں آئے۔ تعلیم عربی اور مذہبی تعلیم کے مشہور اداروں مثلاً ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ کی امداد واعانت میں بھی کانفرنس نے بہت بڑا حصہ لیا۔'[3]

آئندہ سطور میں ایک اہم حوالہ ملاحظہ فرمائیں، سید معروف لکھتے ہیں:

'سرسید احمد خاں کو جب 'محمڈن کالج' کے قیام ۲۴ر مئی ۱۸۷۵ء کی جانب سے

---

1. آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی صد سالہ تاریخی ڈائری: ۱۸۸۶ء تا جون ۱۹۸۶ء، مرتبہ: سید الطاف علی بریلوی (علیگ) طبع کراچی، ص ۸، ۹۔
2. 'سالہا سال تک کانفرنس کے ساتھ ہی لیگ کے اجلاس ہوتے رہے تا آنکہ حضرت قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں مسلم لیگ اس قدر بڑھی کہ اس کی جہد خاص سے پاکستان وجود میں آیا جو آج دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے۔' (ایضاً، ص ۹)
3. ایضاً، ص ۹

اطمینان ہوا تو انھوں نے سوچا کہ صرف ایک کالج سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہوگا اس لیے کہ دور دراز علاقوں میں رہنے والے مسلمان ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر ہیں اور کوئی ایسا ذریعہ نہیں کہ صوبوں اور اضلاع کے لوگ ایک جگہ جمع ہوں اور قوم کی تعلیم و ترقی کے سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں کہ قومی یگانگت اور ہمدردی پیدا ہو اور تعلیم و ترقی کی سمت نمائی ہو سکے۔ اسی خیال کے تحت ۱۸۸۶ء میں انھوں نے 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' کی بنیاد رکھی۔ ۱۸۹۰ء میں اسے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ابتدا میں کانفرنس کے مقاصد حسب ذیل تھے (دیکھیے پنجاہ سالہ تاریخ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۳۷ء)

۱۔ مسلمانوں میں یوروپین لٹریچر کے پھیلانے اور اس کو وسعت دینے اور انھیں اعلیٰ درجے کی تعلیم دینے کی کوشش کرنا۔

۲۔ مسلمانوں نے جو قدیم علوم میں ترقی کی اس کی تحقیقات کرا کے شائع کرنا۔

۳۔ نامی گرامی علما اور مشہور مصنفین اسلام کی سوانح عمریوں کو اردو یا انگریزی میں لکھوانا۔

۴۔ مسلمان مصنفین کی وہ تصنیفات جو نایاب ہیں ان کا پتا لگانا کہ وہ کس جگہ موجود ہیں اور پھر انھیں ازسرِ نو شائع کرنا۔

۵۔ تاریخی واقعات اور قدیم تحقیقات پر لوگوں کو تقریر پر آمادہ کرنا۔

۶۔ بنیادی علوم کے کسی مسئلہ یا تحقیقات پر کسی رسالہ کے تحریر ہونے یا لکچر دینے کی تدابیر کرنا۔

۷۔ فرامین شاہی کو بہم پہنچا کر ان سے کتاب انشا کا مرتب کرانا اور ان کے نمونے فوٹوگراف کے ذریعہ سے قائم کرنا۔

۸۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے قائم ہیں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور بقدر امکان عمدگی سے اس

تعلیم کو طلبا میں پھیلانا۔ (پنجاہ سالہ تاریخ، ص ۴۔۵)[۱]

آگے جانے سے پہلے اگر پروفیسر ڈاکٹر نجیب جمال کے مقالے 'یگانہ۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ' سے استفادہ کر لیا جائے، تو مذکورہ دور کے سیاسی و سماجی، تہذیبی و تمدنی، فکری و مذہبی اور علمی و ادبی پس منظر سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

'خالص علمی نقطۂ نظر سے اس عہد کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے ہاتھوں پٹ جانے کے بعد ہندوستان کے لوگوں میں فکری و علمی افلاس کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب قدامت اپنی تمام بچی کھچی قوت اور توانائیوں کو سمیٹ کر جدیدیت سے ٹکرا گئی تھی۔ فکری و علمی افلاس اپنے ساتھ غلامی، محکومی اور نقاہت لے کر آیا۔ ایسے میں ایک طرف تو وہ طبقہ تھا جو پُرانے معیاروں ہی کو سب کچھ جانتا تھا اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو روحانیت کے مقابلے میں مادّیت کی طرف جھکتے جا رہے تھے (؟) اور

---

۱ محمد معروف، سید۔ مضمون بعنوان 'انجمن ترقی اردو: مختصر تاریخی جائزہ' مشمولہ: ادب و کتب خانہ، کراچی: بزم اکرم، ۲۰۱۴ء، ص ۴۰۔

۲ ایسے پُرخطر اور کٹھن مرحلے میں بھی ہمیں مولانا سلیمان اشرف ہی کا آہنگ سنائی دیتا ہے، جو ان کی غیر معمولی دینی غیرت و حمیت اور مومنانہ حق گوئی و بے باکی پر شاہد عادل ہے چناں چہ اپنے رسالہ 'الرشاد' میں یاد دلاتے ہیں: 'مسلمانوں کی انتہائی بدقسمتی یہی ہے کہ یہ کسی غیر قوم کی طرف اس غرض سے بڑھتے ہیں کہ اپنی حیات دنیا سنوارنے کا طریقہ اُس سے سیکھیں، لیکن اس سے پیشتر کہ ان وسائل و اسباب پر انھیں دسترس ہو دین و مذہب پہلے کھو بیٹھتے ہیں۔ مسلمانوں کا ایک عہد عیسائیت کے ساتھ تعشق و شیفتگی کا تھا مسلمان ہمہ تن اس میں حلول و جذب ہو جانے کے لیے بے تاب تھے۔ لیڈرانِ قوم نے اُس وقت نہایت بلند آہنگی سے یہ صور پھونکا تھا کہ اگر باعزت و حرمت دنیا میں رہنا چاہتے ہو تو یورپ میں جذب ہو جاؤ، مسلم ہستی بذات خود قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ اسلامی انداز جلد سے جلد چھوڑو اور یورپ کے اسلوب اختیار کرو۔ پھر کیا تھا مسلمانوں کی شکل و صورت، لباس و پوشاک طرز ماند و بود غرض ہر ایک شعبۂ حیات میں یورپ ہی کی تجلی تھی۔ حتیٰ کہ نام تک یورپین تلفظ و املا میں شامل کر لیا گیا، ارکان اسلام سے بیگانہ وشی لوازم تہذیب و تعلیم قرار پائے، عیسائیت میں جذب ہونے کے لیے مسائل شرعیہ میں طرح طرح کی تحریفیں کی گئیں، آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے مطالب میں عجیب و غریب معنی آفرینیوں سے کام لیا گیا۔ (الرشاد: ۱۹، ۲۰)

جن میں گرد و پیش کا تجزیہ کرنے کا شعور موجود تھا، سرسید کی علمی و ادبی تحریک نے اس لمحے میں جنم لیا۔ علی گڑھ تحریک کے پس منظر میں شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء۔۱۷۶۲ء) کے علمی نظریات دکھائی دیتے ہیں[1]۔ سرسید علوم عقلیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی تحصیل کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت قرار دے کر علمی سطح پر اس کے فروغ کے لیے کام کیا۔ سوسائٹیاں، مدرسے اور کالج قائم کیے اور اپنے نظریات و افکار کی ترویج کے لیے اپنے بڑے بھائی سید محمد خاں کے فارسی اخبار 'سید الاخبار' سے کام لیا اور پھر خود بھی 'سائنٹیفک[2] سوسائٹی گزٹ' اور 'تہذیب[3] الاخلاق' کا اجراء کیا جنھیں برصغیر[4] (برعظیم) کی صحافتی، علمی اور ادبی تاریخ میں خاصا نمایاں مقام حاصل ہوا۔[5]

....

[1] 'سرسید نے اپنی تصانیف میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ' کو اکثر جگہ نقل کیا ہے اور اپنے دلائل کو اس سے تقویت دی ہے۔ (سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے۔ ص ۱۳۲)

[2] ۱۸۶۲ء میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی، تو اس کا ایک مقصد سرسید نے یہ قرار دیا تھا کہ ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کمیاب کتابوں کو تلاش کر کے چھاپا جائے۔ بریلی میں ایک بار تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کو کھو دے"۔ (جواب ایڈریس انجمن اسلامیہ بریلی۔ "لیکچروں کا مجموعہ"، ص ۱۳۳)

سید احمد خاں سے زیادہ قومی اور تاریخی سرمایہ کی حفاظت کا خیال شاید ہی ہندوستان میں کسی شخص کو پیدا ہوا ہو۔ آثار الصنادید کو لکھتے وقت ان کا جذبہ یہی تھا کہ کاروان رفتہ کے ایک ایک نقش کو محفوظ کر لیا جائے۔ انھوں نے فارسی مآخذ تاریخ کو ایڈٹ کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی، ابوالفضل کی آئین اکبری اور جہانگیر کی تزک کو بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ گزشتہ کم و بیش ایک صدی سے سرسید کے مرتب کیے ہوئے یہ ایڈیشن تاریخ کے طلبا کے زیر مطالعہ ہیں۔ ان کتب وغیرہ کو شائع کرتے وقت ان کے ذہن میں اگر کوئی بات تھی تو یہ کہ اپنے تاریخی سرمایہ کو دست برد زمانہ سے بچا لیں'۔ (نظامی، پروفیسر خلیق احمد۔ 'سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے'۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۹۳ء۔ ص ۸۸۔۸۷ و بعدہ')

[3] ۱۸۷۰ء میں 'تہذیب الاخلاق' کا اجراء ہوا۔ 'تہذیب الاخلاق' نے سیاسی، مذہبی، معاشرتی، تہذیبی، علمی اور ادبی پہلوؤں کا احاطہ کیا اور ذہنی انقلاب کی راہیں کشادہ کیں۔

[4] 'لوگ Sub Continent of Indo-Pakistan کا ترجمہ برصغیر پاک و ہند کر دیتے ہیں۔

(باقی بر صفحہ آیندہ)

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے مقالہ میں اس دوران ہندوستان میں قائم کیے جانے والے بعض سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی اداروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ: ۱۸۵۷ء کا سال ایک ایسی حد بن کر آیا جہاں قدیم اور جدید ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ دہلی[6] کالج کی تاسیس ۱۸۲۵ء میں ہوئی۔ اس سال کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونی ورسٹیاں قائم کی گئیں۔ ۱۸۶۷ء میں دار العلوم دیوبند[7] کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۷۰ء میں لاہور میں 'اورینٹل کالج' قائم ہوا جہاں السنہ مشرقی کی

....

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

حالاں کہ اس میں 'بنگلہ دیش' بھی شامل ہے۔ ثانیاً جب ہم (Continent) کا ترجمہ براعظم کرتے ہیں، تو پھر Sub Continent کا ترجمہ برصغیر کیوں کر صحیح ہے۔ اعظم کا اسم تصغیر عظیم ہے صغیر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شہرۂ آفاق مورخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنی تصنیف کا نام 'برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ' رکھا۔ اُس وقت تک بنگلہ دیش کا وجود نہ تھا'۔ (محمد اسلم، پروفیسر: 'تحریک پاکستان'، ص ۱۲)

[5] نجیب جمال، ڈاکٹر: 'یگانہ۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'۔ لاہور، اظہار سنز۔ بار اول ۲۰۱۳ء، ص ۳۶، ۳۷۔

[6] 'دہلی کالج کی تاسیس کے مقاصد میں اگرچہ میکالے کی تعلیمی پالیسی کے علاوہ ہندوستانی کلرک سستے داموں خرید کر سیاسی بے اطمینانی کم کرنا تھا مگر بقول عتیق صدیقی: 'یہی کالج آگے چل کر مغربی علوم اور مغربی خیالات کی تبلیغ و اشاعت کا مرکز اور ہماری نشاۃ الثانیہ کی تحریک کے ان نوخیز پودوں کی آب یاری کا بڑا منبع بن گیا جن کی فورٹ ولیم کالج (قائم شدہ ۱۸۰۰ء) نے تخم ریزی کی تھی۔ دلی کالج نے وقت کے شدید تقاضوں کو جس طرح پورا کیا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کالج کے فارغ التحصیل طالب علموں میں مورخ، سائنس داں، ادیب، نقاد، ریاضی داں اور اخبار نویس بھی نکلے جو اُردو اخبار نویسی کے سابق الاولوں میں گنے جاتے ہیں'۔ ("ہندوستانی اخبار نویسی۔ کمپنی کے عہد میں") انڈس پبلی کیشنز کراچی، ۱۹۸۰ء، ص ۳۲۰)۔ دہلی کالج کا روشن پہلو یہ ہے کہ اس درس گاہ میں میکالے کے منصوبے کا وہ پہلو ثمر بار نہ ہو سکا جس کا مقصد ہندوستانی سر میں انگریزی دماغ رکھنا تھا'۔ (نجیب جمال، ڈاکٹر: ایضاً، ص ۳۷)

[7] بقول عبد الرشید میاں: 'دلچسپ بات یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک کے بانی سید احمد خان اور دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی دونوں ایک ہی استاد مولانا مملوک علی نانوتوی کے شاگرد تھے۔ مولانا قاسم، حاجی امداد اللہ صاحب کے سلسلۂ بیعت میں داخل تھے۔ حاجی صاحب موصوف شاہ محمد اسحاق سے فیض یافتہ تھے، جو شاہ عبد العزیز کے نواسے اور جانشین تھے۔ حاجی صاحب ساری عمر مختلف اسلامی فرقوں کے اختلافات دور کرنے میں کوشاں رہے۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ مسائل نزاعیہ میں سے اکثر میں محض نزاع لفظی ہے، اور مقصود متحد۔ شروع میں یہ حضرات فرقہ پرستی سے بالا راہ اعتدال پر گامزن رہے، مگر بعد میں انھوں نے اپنی مصالحت پسندانہ روش ترک کر دی اور خود ایک

(باقی اگلے صفحہ پر)

تدریس کے ساتھ ساتھ یورپی علوم وفنون، جدید ہندوستانی زبانوں (عربی، فارسی، ہندی اور اُردو) کے ذریعے پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ۱۸۷۷ء میں سرسیّد نے جدید تعلیم کو فروغ دینے کے لیے 'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج' قائم کیا جس نے آگے چل کر مسلمانانِ ہند کی فکری و علمی رہنمائی کا فریضہ ادا کیا۔ سرسیّد ہی نے ۱۸۸۶ء میں 'آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' کی بنیاد ڈالی، جس نے 'آل انڈیا مسلم لیگ' کے قیام کی راہ ہموار کی۔[1]

(بقیہ حاشیہ)

فرقہ بن کر دوسرے فرقوں کے مقابل آ گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے اپنے بزرگوں کی وسعت نظری کو بھی ترک کر دیا اور روحِ اسلام کو نظرانداز کر کے چھوٹی چھوٹی باتوں پر زور دینے اور لڑنے جھگڑنے لگے۔ خاص طور پر ان کے افکارِ مغرب (یا علومِ مغرب؟) سے بیزاری نے انھیں بہت نقصان پہنچایا۔ اپنے ذہنوں کو مسدود کر لینے کے باعث ان کے فکر کے سوتے خشک ہو گئے۔ نیز ان کی کانگرس سے وابستگی نے مسلمانوں کو بہت سیاسی نقصان پہنچایا۔ بجز مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے چند رفقاء کے، ان میں سے کسی قابلِ قدر ہستی نے تحریکِ پاکستان کا ساتھ نہ دیا۔ (حوالہ: پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر، مشمولہ: بابِ دیو بند۔ ص ۱۱۱ و بعدہٗ۔ ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور ۱۹۸۲ء)۔ افسوس اس بات کا ہے کہ جمعیت العلمائے ہند کے رول کو سراہنے والے عناصر، جواب وطنِ عزیز میں مولانا عثمانی مرحوم کی جمعیت علمائے اسلام کے پلیٹ فارم سے سیاست کر رہے ہیں، پاکستان کے قیام کو 'گناہ' سے تعبیر کرتے ہوئے اس مملکت کے بنانے اور اس کی حمایت کرنے والوں کو ملزم گردانتے ہیں (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کہتے ہیں: "مفتی محمود اور مولانا یوسف بنوری، جو کہ جمعیت العلماء ہند صوبہ گجرات کے صدر تھے، ان دونوں کا نظریہ یہ ہے کہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کو پاکستان بنانے کے جرم کی پاداش میں قبر میں عذاب مل رہا ہے"۔ (حوالہ: دی گریٹ لیڈر (اردو)۔ جلد اول۔ ص ۹۷۔ آتش فشاں لاہور ۲۰۱۱ء)۔

[1] "آج ہم آسانی دیکھ سکتے ہیں کہ سرسید نے جس سیاسی پالیسی کی بنیاد رکھی تھی، بالآخر قوم نے اسی کو اختیار کیا اور وہی کامیاب رہی۔ مسلمانانِ ہند کی فکری اور سیاسی لیڈر شپ مغربی تعلیم یافتہ اصحاب ہی نے سنبھالی۔ اقبال اور قائداعظم دونوں اعلیٰ مغربی تعلیم سے مرصع تھے۔ انھی کی مساعیٔ جمیلہ سے پاکستان قائم ہوا۔ اور پاکستان کا قیام سرسید ہی کی پالیسی کا نتیجہ اور اس کی صداقت پر مہر ہے۔ (عبدالرشید، میاں۔ 'پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر'۔ مشمولہ: سرسید احمد خان۔ ص ۱۱۰)؛ حقیقت یہ ہے کہ اگر سرسید اور ان کے مغربی تعلیم کی تحریک نہ ہوتی تو مسلمان آزادی کی تحریک میں اس طرح شریک نہ ہو پاتے۔ ۱۹۰۷ء میں مولانا محمد علی نے سرسید کی روح سے یہ کہہ کر۔

سکھایا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا ۔۔۔ جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

ایک تاریخی حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے'۔ (خلیق احمد نظامی، پروفیسر: 'سرسیّد کی فکر اور عصرِ جدید کے تقاضے'۔ ص ۱۱۰)۔

۱۹۱۷ء میں حیدر آباد میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا جس کا سہرا میر عثمان علی خاں والیٔ حیدر آباد کے سر ہے۔ اس ادارے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام مغربی علوم اُردو زبان میں پڑھائے جانے لگے اس کے ساتھ انگریزی زبان کی تعلیم بھی لازمی مضمون کے طور پر برقرار رہی۔ مغربی علوم وفنون کی درسی کتابوں کے اُردو ترجموں کے لیے ۱۹۱۷ء میں 'دارالترجمہ' قائم ہوا جہاں مستند اور معیاری کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں مولانا محمد علی جوہر کی کوششوں سے 'جامعہ ملّیہ اسلامیہ' کا قیام عمل میں آیا، ۱۹۲۵ء میں اسے دہلی منتقل کر دیا گیا۔[1]

ازیں علاوہ اسلامیہ کالج لاہور (قیام: یکم مئی ۱۸۹۲ء) اور اسلامیہ کالج پشاور (آغاز: ۱۹۱۳ء) بھی قائم کیے گئے تھے۔ سیّد احمد خان اور دیگر قائدین اس امر کو پا چکے تھے کہ صرف مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ ہر قوم کی ترقی و اعلیٰ کامیابی کا راز صرف مسئلہ تعلیم کے عمدہ طریقے سے حل ہونے پر مبنی ہے، اور یہ فریضہ ایجوکیشنل کانفرنس بخیر وخوبی انجام دے رہی تھی۔

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ انقلاب حکومت اور تغیراتِ زمانہ سے ہر چیز اثر پزیر ہوتی ہے، اس انقلاب اور مغربی خیالات کی ترقی واشاعت نے ہندوستان میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے مسئلہ کو نہایت اہم اور ایک لحاظ سے پیچیدہ بھی بنا دیا تھا۔ جب کہ اسلامی عہد حکومت میں قدیم و جدید علوم کی کشمکش نہ تھی یہ مسائل کبھی زیر بحث ہی نہ آئے تھے، جو اس دور میں پیدا ہو گئے۔

جیسا کہ مشاہدہ میں آیا، متحدہ ہندوستان کے طول وعرض میں جب ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخیں قائم ہو رہی تھیں، تو بعض حساس مسلمان جو غالباً کم نظری مگر دیانت داری سے یا پھر شاید طرزِ کہن پر اڑنے اور آئینِ نو سے ڈرنے کے مصداق کانفرنس کی سرگرمیوں سے اپنے کو بچانا چاہتے تھے، کی جانب سے کچھ خدشات کا اظہار کیا جانے لگا، اور اس کے ازالہ کے لیے انھوں نے اس وقت کے اہل علم سے رجوع کرنا مناسب سمجھا اور ان کے سامنے ایک سوال استفتا کی صورت[2]

[1] یگانہ۔ تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔ ص ۴۸

[2] استفتا۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس سوال میں کہ اس ملک کاٹھیاواڑ میں ایک مجلس بنام کاٹھیاواڑ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں کی تعلیمی مجلس قائم ہوئی ہے جن کے محرک ومختار تبعین و متعلقین علیحدہ

(باقی بر صفحہ آئندہ)

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

کالج ہیں۔ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۱۶ء کو ان کا پہلا جلسہ جونا گڈھ میں ہوا، جس کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، نظامت کے فرائض منشی غلام محمد بیرسٹرایٹ لا کاٹھیاواڑی نمائندہ علیگڈھ کالج وجوائنٹ سیکریٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے انجام دیے، حاضرین جلسہ سے خطاب مشہور واعظ مولوی سلیمان پھلواروی نے کیا۔ اس کانفرنس کا مقصد وحید تمام مسلمانوں کی دینی و دنیوی ترقی بتایا گیا ہے۔ ایک ایسی کانفرنس جس میں بجملہ مدعیانِ اسلام شمول ایسے گروہوں کے کہ جن سے مسلمانانِ اہل سنت و جماعت کو بنیادی نوعیت کے اختلافات ہیں، ہم (بحیثیت سواد اعظم) کیا اس تعلیمی کانفرنس کے لیے دامے، درمے، قدمے، سخنے کسی قسم کی معاونت کرسکتے ہیں۔ جواب آنے پر ان شاء اللہ تعالیٰ اس استفتا کو چھپوا کر اس ملک کاٹھیاواڑ و گجرات وبرما وغیرہا جگہ پر بغرض اشاعت مسلمانوں میں عام طور پر تقسیم کیا جائے گا۔

فقط......راقم آثم خادم قاسم میاں عفی عنہ

از مقام گونڈل علاقہ کاٹھیاواڑ

تاریخ ۱۲ر محرم الحرام ۱۳۳۵ ہجریہ مقدسہ پنجشنبہ

ماخوذ......(استفتا: الدلائل القاہرۃ علی الکفرۃ النیاشرہ) بار اول ۱۹۱۷ء

بدقسمتی کیسی اس قوم کے ہمرکاب رہی ہے کہ موہوم و مفروض خدشات کو بنیاد بنا کر علوم عصری پر رقیب اقوام کے برابر لانے بلکہ ان پر سبقت لے جانے کی سعی جمیل کے خلاف علمائے دین سے ایسے فتاویٰ حاصل کیے گئے، جن کے باعث اس رہ روشن کو تاریکیوں سے ڈھانپ کر ملت کی منزل کھوٹی کی گئی۔ ساون کے کچھ اندھوں کو آج بھی ہرا ہرا ہی سوجھتا ہے حالانکہ زمانے کے پلوں کے نیچے سے پانی اپنی پوری رفتار کے ساتھ بہتا چلا آرہا ہے۔ بعض ایسے ایمان فروش، مفاد پرست بھی ہیں کہ ان فتاویٰ کے پشتارے اپنی کمر پر اُٹھائے سربازار نفرتوں کی تجارت سے پیٹ کا دوزخ بھر رہے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد نے کہا تھا: 'انقلابات و حادثات نے ماضی کے بہت سے نظریات کو یا تو رد کردیا ہے یا پھر ان پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے'۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ آج بھی بعض حضرات پوری استقامت کے ساتھ 'مرغ کی ایک ہی ٹانگ' پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ علامہ نے ہمارے اس مرض پر بجا طور پر کہا تھا۔

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

مقام صد اطمینان امر یہ ہے کہ ہر دور میں صاحبانِ بصیرت نے بنظر غائر حقائق کو دیکھا اور رائے عامہ کی رو میں بہ نکلنے کے بجائے اپنی بات دوٹوک انداز میں کہی بھی۔

چناں چہ فتاویٰ کی بھیڑ میں علامہ شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی حضرت مولانا محمد عبدالعلیم صدیقی میرٹھی رحمۃ اللہ (۲ر اپریل ۱۸۹۳-۲۲ر اگست ۱۹۵۴ء) کا فتویٰ ایک روشن چراغ کی مانند آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ اُن کی دُوررس نگاہ کو خراج تحسین پیش کرتا نظر آتا ہے:

۳۵

(۴۹) تصدیق جناب مولانا مولوی محمد عبدالعلیم صاحب میرٹھی زید مجدہ

مبسملاً وحامداً ومحمداً (جل وعلا) ومصلیاً ومسلماً محمداً (صلی اللہ علیہ وسلم) اما بعد کاٹھیاواڑ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسلمانان کاٹھیاواڑ کی ایک تعلیمی انجمن ہو مسلمانوں میں علوم کی روشنی پھیلانا اور ان کو جہالت کے تحرفات سے نکالنا ایک ایسا ضروری و اہم امر ہے جس کے متعلق قرآن عظیم میں یوں وارد ہوتا ہے ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر نیز ارشاد ہوتا ہے کہ یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم درجت طلب علم کے متعلق زبان حضور عالم ماکان وما یکون صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہم کو طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ نیز اطلبوا العلم ولو کان بالصین۔ لیکن سب سے اہم سوال یہ ہے کہ یہاں علم سے مراد کونسا علم ہے کیونکہ مدینۃ العلوم حضرت سیدنا مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کا ارشاد ہے کہ العلوم خمسۃ الفقہ للادیان والطب للابدان والہندسۃ للبنان والنحو للسان والنجوم للزمان کذا فی مدینۃ العلوم وقال الامام الشافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ العلم علمان علم الطب للابدان وعلم الفقہ للادیان۔ سوال مذکور العصر کا جواب آیات کلام عظیم واحادیث نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے مضامین کو ترتیب دینے سے بادنیٰ توجہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں اس علم سے مراد علم دین ہی ہو چنانچہ اسی پر مفسرین و محدثین کا اجماع ہے اور اگر جیسا کہ بعض آدمیین معانی آیات واحادیث کہتے ہیں کہ علوم ابدان بھی اسی میں داخل ہیں تو کہا یہ امر یقینی ہے کہ علوم دینی کو ہر نوع علوم ابدان پر اولیت آن اولین کے نزدیک بھی مسلم ہوگی اسلیے معاملات تعلیم و تعلم علوم پر غور کرنے والوں کے لیے منکو جناہی نہیں بلکہ لازم ہے فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون اہل ذکر ہونا انسان رنج کا مورد بننے کے لیے الذین امنوا کا ہونا نیز طلب علم کی فرضیت کا حکم پانے والوں کے لیے مسلم ومسلمہ کا ہونا لازم ہے پس جہاں مسائل تعلم و تعلیم پر غور کرنے کے لیے امر ضروری ہے کہ وہ افراد جمیع نبوی ہوں جو یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر اور اھل الذکر کے مصداق کہلائے جاسکیں اور تعلیمی غور کرنے والے یرفع اللہ الذین امنوا منکم کی آیت کو ملحوظ رکھ کر تحفظ ایمان واسلام واشاعت علوم دین کو فرض اہم و اولین کو محسوس کرتے ہوئے حسب ضرورت زمانہ کے لیے تجارت و زراعت صنعت و حرفت نیز لیں السنہ و کتب کے تعلم و تعلیم کے متعلق بھی مشورہ کریں جن کے حصول سے دین میں نقصان آنے کا احتمال ضعیف بھی نہ ہو تو البتہ انجمن محمود اور اس انجمن کی شرکت محمود کہی جائے گی البتہ اگر انجمن مذکورہ من القبیل و الاولیاء ہیں [illegible] مشورہ تعلیم و تعلم علوم غرب دین و ایمان تو وہ انجمن یقیناً مردود اور اس کی شرکت سے اہل ایمان کے لیے ہر طرح گریز یاب ہے جیسا کہ اوپر انکے نتائج سے وضاحت ثابت ہو چکا [illegible] واعلم وعلمہ جل مجدہ اکمل واتم۔ فقیر محمد علیم عفا القادری غفرلہ

رسالہ الدلائل القاہرۃ کے صفحہ ۳۵ کا عکس

وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

مسلمانو تمہاری دین و دنیا کی بھلائی اور سچی حقیقی خیر خواہی کیلیے یہ مبارک فتوے امام اہل سنت قامع بدعت قالع ندویت و نیچریت مجدد مأتہ حاضرہ مؤید حاضرہ اعلیحضرت مولانا مولوی مفتی احمد رضا خانصاحب قادری برکاتی متع اللہ المسلمین بطول بقائھم دربارہ کاٹھیاوار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہے جسمیں بدلائل قاہرہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس میں شرکت اور کسی قسم کی امداد حرام اور سخت حرام ہے اسے بغور پڑھو اور اپنا بھلا چاہو تو اسپر عمل کرو نیز تمہارے مزید اطمینان کیلیے اس فتوے کی تائید و تصدیق میں مشاہیر علمائے ہند کے جلیل القدر فتوے ہیں

الدلائل القاهرة علی الکفرة النیاشرة

مؤلفہ

حامی ملت جناب حاجی قاسم میان صاحب امام جامع گونڈل علاقہ کاٹھیاوار

حسب فرمائش جناب منشی حاجی لعل خانصاحب زکریا اسٹریٹ کلکتہ

جناب حکیم مولوی ابو العلا امجد علی صاحب اعظمی قادری رضوی نے

مطبع اہل سنت و جماعت بریلی میں چھپا کر شائع کیا

باراول ... جلد

عکس سرورق: رسالہ "الدلائل القاہرة علی الکفرة النیاشرة" مطبوعہ بریلی ۱۹۱۷ء

وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

مسلمانو تمہاری دین و دنیا کی بھلائی اور سچی حقیقی خیر خواہی کیلئے یہ مبارک فتوائے امام اہل سنت قامع بدعت قالع ندویت و نیچریت مجدد مأتہ حاضرہ طاہرہ اعلیحضرت مولانا مولوی مفتی احمد رضا خانصاحب قادری برکاتی رضی اللہ تعالےٰ عنہ دربارہ کاٹھیاوار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہے جسمیں بدلائل قاہرہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس میں شرکت اور کسی قسم کی امداد حرام اور سخت حرام ہے اسے بغور پڑھو اور اپنا بھلا چاہو تو اسپر عمل کرو نیز تمہارے مزید اطمینان کیلیے اس فتوے کی تائید و تصدیق میں مشاہیر علمائے ہند کے جلیل القدر فتوے ہیں

الدلائل القاهرة علی الکفرة النیاشرة

یعنی مسلم لیگ کی شرکت و رکنیت و امداد و اعانت کا حکم شرعی بھی واضح و آشکار

مؤلفہ

حامی سنت جناب حاجی قاسم میاں صاحب امام جامع گونڈل علاقہ کاٹھیاوار

حسب فرمائش اراکین انجمن تبلیغ صداقت بمبئی

پرنٹر سلطان حسین خاں نے مطبع سلطانی واقع ...... بمبئی میں چھپا

پبلشر

مفتی مصطفےٰ خاں قادری فیض آبادی نے شائع کیا

بار دوم اکیہزار جلد — ۱۹۴۲ء — قیمت

عکس سرورق: رسالہ "الدلائل القاہرة علی الکفرة النیاشرة" طبع بمبئی ۱۹۴۲ء

میں مرتب کر کے یہ جاننا چاہا کہ مذکورہ تعلیمی کانفرنس کے اجلاسوں میں ان کی شرکت یا ان کی کسی قسم کی اعانت کے بارے میں کیا حکم ہے۔

وقت تفہیم کی راہیں بناتا ہے:

سن ستاون کے بعد (بالخصوص ۱۸۶۵ اور ۱۸۷۵ء کے درمیان) مغربی تعلیم کی ترقی پزیر حالت نے علمائے کرام اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے درمیان خاصا اختلاف پیدا کر دیا تھا۔ تعلیمی کانفرنس کے قائدین مذکورہ احوال سے ہرگز بے خبر نہ تھے۔ اس لیے وہ اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے پیدا شدہ خلیج کو پاٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ امت مسلمہ کا اجتماعی مفاد ان کے پیش نظر رہا۔ یہ اختلاف بتدریج کم ہوا۔ ۱۹۲۵ء کے ایک اجلاس میں مولانا رحیم بخش اپنے خطبہ صدارت میں فرماتے ہیں:

"..... افسوس ہے کہ اجتماعی حیثیت سے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے مسئلہ کی اہمیت کا صحیح اندازہ کیا گیا اور نہ ابتدا میں ان دشواریوں کو حل کرنے کی کوشش کی گئی، جو مذہبی تعلیم کی راہ میں حائل تھیں۔...... ہر زمانہ کے لیے یکساں طریقہ تعلیم مفید نہیں ہو سکتا، اسی وجہ سے ہمیشہ بہ مقتضائے حالات تبدیلیاں ہوتی رہیں اور آئندہ بھی ہوں گی۔ اس لیے ہم کو ان جدید مشکلات کے حل کرنے کے لیے بھی آمادہ ہو جانا چاہیے، تاکہ ہر جماعت اپنے دائرہ عمل کے اندر کام کرے اور قدیم وجدید تعلیم کے لیے جو نظام عمل مرتب کیا جائے وہ ایسا صاف وواضح ہو کہ اختلاف آرا کا اندیشہ کلیتاً زائل ہو جائے۔

مغربی تعلیم کی روز افزوں ترقی واشاعت نے آخر کار مسلمانوں میں بھی ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا، جس کی آزادانہ معاشرت وعقائد نے قدیم جماعت[1] کے

---

[1] دردِ دل رکھنے والے علماء کرام اور ارباب دانش ہمارے علماء دین کی عمومی روش پر بجا طور پر دکھی اور رنجیدہ رہتے تھے۔ پروفیسر سید سلیمان اشرف اعلی اللہ مقامہ اس قدیم مرض کہنہ کی نشان دہی کرتے ہوئے ایک محکم سند پیش کرتے ہیں:۔

"تغیر عالم کو دیکھتے ہوئے علماء کرام نے اپنے دل و دماغ کو سیاسیات کی فکر سے ایسا بے نیاز کر لیا تھا کہ علامہ ابن خلدون کو اس مقدس گروہ کے حق میں یہ فیصلہ دینا پڑا کہ ابعد الناس عن السیاسیة هم العلماء یعنی علماء کا دماغ سیاست کے سمجھنے سے بہت ہی دور ہے"۔

(بحوالہ: النور، ص ۱۹۱)

مذہبی جذبات کو اس حد تک برانگیختہ کر دیا کہ انھوں نے ان نوجوانوں کو ملحد و زندیق قرار دیا۔ گویا مسلمانوں میں دو فریق پیدا ہو گئے جو مدت تک باہم دست و گریباں اور ایک دوسرے سے نا آشنا رہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب رفتہ رفتہ یہ بے گانگی کم ہوتی گئی، اور وہ وقت آ گیا کہ فریقین اپنی اپنی جگہ پر مسلمانوں کی مختلف تعلیمی ضروریات کا احساس کر کے ایک ایسا تعلیمی نظام مرتب کریں، جو مسلمانوں کی ہر قسم کی دنیوی و مذہبی ضرورتوں پر مشتمل ہوتا کہ آئندہ تصادم کا اندیشہ نہ رہے۔ اب وہ زمانہ آ گیا کہ نہ تو انگریزی پڑھنا کفر والحاد خیال کیا جاتا ہے اور نہ مذہبی تعلیم کی ضرورت سے کسی کو انکار ہے، اس لیے کیوں نہ فریقین باہمی معاونت سے کام کریں تاکہ ایک طرف تو مسلمانوں میں جدید علوم وفنون کا رواج ہو اور دوسری طرف ان کا سینہ مذہبی علوم سے منور ہو، اور اسلامی تہذیب و شائستگی ان کا شعار ہو۔

علماء کو بھی اب جدید تعلیم کی ضرورت سے انکار نہیں ہے، اور ندوۃ العلماء[1] کے پلیٹ فارم پر تو بارہا اس کا اعلان کیا گیا کہ وہ انگریزی تعلیم کو صرف قولاً ہی ضروری نہیں سمجھتا بلکہ اس نے اپنے دار العلوم میں انگریزی کو بطور زبان ثانی داخل[2] کر کے عملاً بھی اس کا ثبوت دیا ہے کہ علماء کے لیے بھی مذہبی نقطۂ نظر سے انگریزی

---

[1] ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم ہوا، جس کا مقصد قدیم علماء اور علی گڑھ کے مدبرین کے انتہائی نقطہ ہائے نظر میں اعتدال اور توازن کا راستہ تلاش کرنا تھا اور اس کے ساتھ نصاب تعلیم کی اصلاح، علوم دین کی ترقی، تہذیب اخلاق، شائستگی اطوار کا فروغ، علماء کے باہمی نزاعات کا رفع کرنا اور عام مسلمانوں کی اصلاح وفلاح اس کے مقاصد تھے۔ اردو زبان کا سب سے بڑا اسلامی رسالہ 'معارف' ندوہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ (نجیب جمال، ڈاکٹر: یگانہ۔ تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، ص ۳۴، ۳۵)

[2] 'ندوہ نے مکملہ علوم عربیہ ودینیہ کے ساتھ تعلیم انگریزی بھی داخل نصاب کی تاکہ اس مدرسہ کا فارغ التحصیل طالب العلم اگر انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہے تو پانچ برس میں گریجویٹ ہو جائے اور اگر مطالعہ ومحنت سے کام لے تو اس قدر استعداد اُس میں موجود ہے کہ بغیر داخلہ کالج قوت مطالعہ سے ہر طرح کا فائدہ کتب انگریزی سے حاصل کر سکے۔ ندوۃ العلماء کے سند یافتہ اس وقت ملک میں موجود ہیں جو اُن کی لیاقت وفضل کا ثبوت اُن کی مصنفہ کتابوں سے ملتا ہے'۔ (محمد سلیمان اشرف: 'النور' علی گڑھ ۱۹۲۱ء، ص ۱۹۸)

ایسی ہی ضروری ہے جیسی عام مسلمانوں کے لیے، البتہ ندوہ کی یہ خواہش ضرور ہے کہ انگریزی تعلیم اسلامی تربیت کے ساتھ دی جائے، اور انگریزی خواں جماعت، اسلامی عقائد و روایات سے باخبر ہو، اس کا مقصد سادہ الفاظ میں یہ ہے کہ مسلمان مسلمان رہ کر انگریزی حاصل کریں، اگر وہ ایسا کر سکیں تو اسلام ان کو کسی زبان اور کسی علم و فن کے سیکھنے سے منع نہیں کرتا، تاریخ اسلام میں بکثرت ایسی مثالیں موجود ہیں کہ مسلمانوں نے دوسری قوموں کے علوم و فنون سیکھے بلکہ ان علوم میں یہاں تک کمال حاصل کیا کہ استاد اور امام کے درجہ تک پہنچے۔[1]

سید سلیمان اشرف کا چشم کشا خطاب:

مذکورہ حوالہ کے بعد اگر الخطاب (۱۹۱۴ء) سے درج ذیل اقتباس کا مطالعہ کر لیا جائے، تو ناظرین کرام کو احساس ہوگا کہ وہ مسلمان جو علوم مغربی کو یعنی یورپ کا تمدن، سائنس سب کچھ کفر قرار دیتے[2] (کہ مسلمانوں کو اسلام کے اساسی منابع کی طرف لوٹنا چاہیے) تھے، کہاں کھڑے تھے؟ سید العلما مولانا سید سلیمان اشرف تمدن، سائنس اور قرآن مجید کے تحت فرماتے ہیں:

'پس اے عزیزو، کیا تمدن کی روح اس کے سوا اور چیز ہے؟ کیا سائنس الٰہی اس امر کو منکشف نہیں کرتا کہ کس چیز کو ہم کس طرح اپنے کام میں لائیں؟ اگر یہی بات ہے اور ضرور یہی ہے، تو میں ڈنکے کی چوٹ سے کہتا ہوں کہ تمدن و سائنس کی سنگ بنیاد قرآن کریم کی یہی تعلیمات ہیں۔ سائنس پڑھنا، اس میں

[1] صدارتی خطبہ الحاج مولانا سر رحیم بخش: اجلاس بستم (۲۰واں) ندوۃ العلما لکھنؤ منعقدہ ۲۸ نومبر ۱۹۲۵ء بمقام انبالہ، بحوالہ تاریخ ندوۃ العلما، (حصہ دوم) مرتب: شمس تبریز، مولوی۔ طبع لکھنؤ، بار اول ۱۹۸۴ء، ص ۲۹۳ و بعدہٗ۔
[2] مولانا سلیمان اشرف نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم کی مخالفت اس لیے کر رہے ہیں کہ ان کے خیال میں ایک غیر ملکی اور غیر مسلم قوم کی زبان سیکھنا مذہباً جائز نہیں تو آپ نے مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کی، پُر زور مضامین اور خطبات کے ذریعے ایسے اوہام و خیالات فرسودہ کی نہ صرف تردید کی بلکہ ثابت کیا کہ مذہب علوم جدیدہ کا مخالف نہیں ہے۔ اس طرح مسلمانوں میں سرسید کی تعلیمی کانفرنس کے خلاف نفرت میں کمی پیدا ہوئی اور تحریک علی گڑھ کو تقویت ملی۔

کمال پیدا کرنا، حقیقت میں مسخرہ مخلوق سے مستفید ہونا ہے، اور اُن کے مسخر ہونے کو بامعنی بناتا ہے۔ کوئی وجہ اس کی نہیں کہ قرآن ہمیں جن اُمور کی طرف رہنمائی کرے جن سے بہرہ مند ہونے کی ترغیب دلائے ہم اُسے مذہب کے خلاف سمجھیں۔ پھر تو کھانا پینا، پہننا، رہنا سب ہی دشوار ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ کون سی زبان میں ان علوم کو پڑھیں؟ اس تنگ وقت میں زیادہ بحث کا تو موقع نہیں لیکن اس قدر سمجھ لیجیے کہ اُردو، فارسی، پنجابی، پشتو، بنگلہ وغیرہ وغیرہ تو جائز ہوں مگر یورپ کی زبان حرام آخر اس کی وجہ؟ اگر آج تمام یورپ یا کوئی اُس کا حصہ دائرۂ اسلام میں آ جائے تو کیا اُسے اپنی مادری زبان کا بولنا یا اُس میں پڑھنا حرام ہو جائے گا؟ کیوں خدا کی رحمت کو اس قدر تنگ کیا جائے؟ اور ترجیح بلا مرجح دی جاوے؟ الحکمۃ ضالۃ المؤمن حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے اپنی چیز جہاں تمھیں مل جائے اُسے فوراً اٹھا لو

سخن کز بہر حق گوئی چہ عبرانی چہ سُریانی
مکان کز بہر او جوئی چہ جابلقا چہ جابلسا[1]

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ بعض مسلم راہنماؤں کا خیال تھا اور بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی، 'وہ یہ سمجھتے تھے کہ سید احمد خاں مشرقی علوم کے دشمن ہیں اور اپنی ہر قومی چیز کی قیمت پر غیر ملکی چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں[2]۔ سید احمد خاں کی پوری زندگی، ان کی تصانیف کا ایک ایک حرف اس خیال کی تردید کرتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ مشرق کی ہر عمدہ چیز کو باقی رکھا جائے لیکن مغرب کی بھی کسی اچھی چیز کے حاصل کرنے میں گریز نہ کیا جائے۔ امرتسر میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے ایک بار کہا تھا:

'مسلمانوں کو بھی یہ لازم ہے کہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں۔ یہ ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان اور ہمارے قدیم ملک کی زبان ہے جو فصاحت و بلاغت میں سمٹک[3] (Semtic) زبانوں میں لاثانی ہے مگر افراط و تفریط نہ ہو۔ اس زبان میں ہمارے مذہب کی ہدایتیں ہیں لیکن جب کہ ہماری معاش، ہماری بہتری، ہماری

[1] الخطاب، ص ۲۲، ۲۳ [2] آثار جمال الدین افغانی، ص ۱۳۶-۱۳۲ [3] سامی زبان۔ زبانوں کے افرو ایشیائی قبیلے کی شاخ جس میں عبرانی، فنیقی، ارامی، اکادی، عربی اور حبشی زبانیں شامل ہیں۔

زندگی بآرام بسر ہونے کے ذریعہ بلکہ ہمارے اس زمانے کے موافق انسان بنانے کے وسائل انگریزی زبان سیکھنے میں ہیں تو ہم کو اس طرف بہت توجہ کرنی چاہیے۔[1]

الغرض بقول انور معین زبیری، متذکرہ دور میں مسلمان خود مغربی علوم وفنون کو اپنے لیے ایک زبردست خطرہ سمجھتے تھے اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے اداروں کو کم زور کرنے پر تلے ہوئے تھے۔[2] حال آنکہ ان تعلیمی اداروں کا قیام اور علوم کا حصول مسلمانوں کے مفاد میں تھا، مولانا سلیمان اشرف رقم طراز ہیں:

'انگریزی سلطنت جب اپنے ساتھ علوم مغربیہ ہندوستان میں لائی تو ہندوستانیوں نے دیکھا کہ اب بقا اور نمود کی زندگی بغیر علوم مغربی حاصل کیے ناممکن ہے، تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور ہندوؤں نے بڑھ کر تعلیم انگریزی کا استقبال کیا اور خوش آمدید کا نعرہ بلند کیا۔ جب اس قوم کے ایک خاص حلقہ میں یہ تعلیم پھیل گئی اور انگریزی کے واقف کار کچھ ہندوؤں میں تیار ہو گئے تو اُن میں احساس پیدا ہوا اور حکومت کے انداز فرماں روائی پر نکتہ چینی شروع کی اپنے حقوق کے باب میں صدائے احتجاج بلند کی ہوم رول سلف گورنمنٹ یا سواراج کا تخیل سب سے پہلے علم مغربی سے آشنا دماغ میں آیا۔ حکومت خود مختاری کی صدا جس نے اپنے مُنھ سے نکالی اور ہندوستان کے رہنے والوں کو یہ سامعہ نواز نغمہ جس نے سُنایا وہ انگریزی دان ہندوستانی تھا۔ کانگریس جو سواراج کا سنگ بنیاد ہے اس کی تاسیس اور پھر اس عمارت کی تعمیر وتکمیل جن ہاتھوں نے کی ہے وہ سب انگریزی خواں اور انگریزی داں ہیں۔ مسلمانوں میں جب علوم مغربیہ کا آغاز ہوا اور پھر ان میں بھی ایک تعداد

---

[1] تقریر بمقام امرتسر بتاریخ ۲۹ر جنوری ۱۸۸۴ء ("لکچروں کا مجموعہ" ص ۱۸۴) بحوالہ سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے، طبع دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۸۷۔

[2] ماضی کے واقعات اس غرض سے فراہم کیے جاتے ہیں کہ آنے والی نسلیں ان سے فائدہ اُٹھائیں اور ان کی روشنی میں اپنے طرز عمل کو درست کر سکیں۔ ماضی کے واقعات قابل فخر بھی ہیں اور باعث عبرت بھی، جو ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ (ظہور الدین)

تعلیم یافتوں کی تیار ہو گئی تو احساس وتاثیر یہاں بھی ظاہر ہونے لگے لیکن افسوس ع

ہم اُبھرتے ہوئے جھونکے میں خزاں کے آئے

(الفور، علی گڑھ ۱۹۲۱ء، ص ۱۹۲، ۱۹۳)

ڈاکٹر ایچ۔بی۔خان نے بھی اپنے مقالہ (تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان وقرارداد مقاصد) کے آغاز میں لکھا کہ: 'لیکن جو قوم یا قومیں تھکن، اضمحلال اور ناکامی سے صرف اس قدر سبق لیتی ہیں کہ ذرا تھوڑا آرام کرنے کے بعد پھر قوائے مضمحل کو تر وتازہ کر کے اور پھر سرگرم عمل ہو جائیں وہ نہ مردہ ہوتی ہیں اور نہ گمنام و بے صدا، بلکہ وہ اپنی تھکاوٹ اور پس ماندگی کے زمانہ تک آرام کر کے تر وتازہ اور ہشاش بشاش ہو کر حوصلہ، عزم، استقلال، جرأت اور مردانگی کے ساتھ اٹھتی ہیں اور پھر اپنی عظمت رفتہ اور چھینے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے سب کچھ قربان کر دیتی ہیں'۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے حوالے سے بات ذرا آگے نکل گئی، تو یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ ۱۸۹۰ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ہندوؤں کی کانگریس کی طرح مسلمانوں کی ایک اہم جماعت کے طور پر متعارف ہو گئی تھی، جس کی بدولت علی گڑھ مسلمانوں کی ہر طرح کی علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی علم افروز سرگرمیاں اہل علم کی نظر میں:

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اسلامیانِ ہند کی پس ماندگی کا ادراک کرتے ہوئے ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں مسلم گرلز اور مسلم بوائز اسکولوں کا جال بچھا دیا، اسلامیہ کالج بھی قائم ہونے لگے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تعلیمی میدان میں بھی مسلمان، ابنائے وطن سے بہت پیچھے تھے۔ جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس وقت تک مسلمانوں کی حالت نہایت ابتر تھی، کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانانِ ہند زوال پذیر[1] ہونا شروع

---

[1] زوال پذیر قوم جبکہ وہ ماضی میں اقبال مند اور صاحب اقتدار واختیار رہی ہو، تو انحطاط کے دور میں اس کی تمام (علمی، فنی، صنعتی وحرفتی، سائنسی، زراعتی، تجارتی، معاشرتی اور معاشی اور دیگر اس قسم کی) ترقی وخوشحالی ماند پڑ جاتی ہے تو وہ مضمحل اور مایوس ہو کر دوسری اقوام کی ترقی وخوشحالی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ (ایچ۔بی۔خان، ڈاکٹر: تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان وقرارداد مقاصد، ص اوّل)

ہوگئے اور اغیار کی محکومیت اختیار کر کے وہ بے شمار معاشی، سیاسی، اقتصادی، تمدنی، ثقافتی، معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔ مرحوم ضیاء الدین اصلاحی، علی گڑھ تحریک پس منظر اور پیش منظر کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

'۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کی ناکامی کے بعد جب مسلمان بے شمار مشکلات و مصائب میں گھر گئے[1] تو انہیں تباہی و بربادی سے بچانے کے لیے علی گڑھ تحریک وجود میں آئی۔ اس کا مقصد ان کی 'نشأۃ ثانیہ' اور ہر شعبۂ زندگی میں اصلاح و انقلاب برپا کرنا تھا چنانچہ مسلمانوں کی مذہبی سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی زندگی پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔[2]

سرسید نے تعلیم کو ان تمام روگوں کا علاج سمجھا۔ مولانا سلیمان اشرف نے اپنے لکچر میں مسلم معاشرہ میں درآنے والی ان خرابیوں کا ذکر بھی کیا ہے اور علم کے اُجالے سے ان کے تدارک کی سعی انجام دی ہے۔ جناب آزاد بن حیدر 'تاریخ آل انڈیا مسلم لیگ۔ سرسیدؒ سے قائدِ اعظمؒ تک' میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پس منظر میں یوں رقمطراز ہیں:

---

[1] 'ہندوستان سے مسلمانوں کی سلطنت جب زائل ہوئی اور ۵۷ء کے واقعہ نے ان کی آنکھیں کھولیں تو انھیں معلوم ہوا کہ سلطنت کے ساتھ کمالات و محاسن بھی ان سے رخصت ہو گئے۔ جب اپنی سلطنت علومِ اسلامیہ کی حمایت و حفاظت کے لیے نہ رہی تو ترقی کے سارے زینے ٹوٹ گئے اور مسلمانوں کے علوم و فنون کی عمارت منہدم ہو گئی۔ جب سلطنت جاتی ہے تو محاسن و کمال صرف اس قوم سے رخصت ہی نہیں ہو جاتے بلکہ کافی مدت کے لیے اُسے دامِ حیرت میں ایسا گرفتار کر جاتے ہیں کہ وہ قوم اس انقلابِ کلی سے متاثر ہو کر عالمِ سراسیمگی میں ششدر و حیران ہوتی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا'۔ (محمد سلیمان اشرف، پروفیسر مولانا۔ "المبین"، ص ۱۸۴، ۱۸۵)۔ '۱۸۵۷ء کا طوفان آیا تو یہ ریت کے تودے ذروں کی طرح ہوا میں اڑتے نظر آئے، نہ سیاسی وحدت کا وجود رہا اور نہ کوئی ملی جمعیت کا نشان، حکمراں طبقے انقلاب کی بھینٹ چڑھے، آبرو والے بے آبرو ہو گئے، دوسروں نے نئے آقاؤں کی غلامی کا طوق اپنایا، مسلمان قوم مرگئی گو مسلمان کروڑوں کی تعداد میں چلتے پھرتے نظر آتے رہے۔ سرسید احمد خاں نے نئے سرے سے قوم کو زندہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ کروڑوں مسلمان صرف بے جان اور بے روح ہی نہ تھے بلکہ ان میں کوئی جماعتی شعور بھی باقی نہ رہا تھا'۔ (محمد سرور۔ 'مضامین محمد علی' مقدمہ، صفحہ الف)

[2] معارف، اعظم گڑھ (بھارت) شمارہ ۵، جلد ۱۴۷۔ مئی ۱۹۹۱ء، مشمولہ: مقالہ 'سرسید اکادمی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا سیمنار، ۲۹ ر اپریل تا یکم مئی ۹۱ء، ص ۳۸۴

'برِعظیم پاک و ہند میں ۱۸۵۷ء کی جدوجہدِ آزادی کے بعد سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی نشأۃِ ثانیہ اور احیائے نو کے لیے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا۔ اس کالج کے قیام کے پس پردہ یہ مقاصد تھے کہ یہ کالج مسلمان نوجوانوں کو جدید تعلیم و تربیت سے آراستہ کرے اور یہاں پر طلبہ کو ہر طرح کی سہولتیں میسر ہوں اور یہ کالج طالب علموں میں انقلابی اور سیاسی شعور پیدا کرنے میں بھی اپنا کردار ادا کرتا رہے۔ اس کالج کے قیام کے بعد انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بھی قائم کی۔ اس کانفرنس کے ہر سال اجلاس منعقد ہوتے[1] اور ان اجلاسوں میں وہ اپنے مسائل اور سیاسی صورتِ حال پر بھی بحث کرتے تھے۔ گویا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانانِ برِعظیم کے لیے ایک موثر اور عمدہ اسٹیج تھا کہ جہاں سے وہ اپنے حقوق کے لیے کچھ کر سکتے تھے۔'[2] مزید لکھا گیا ہے:

'ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعلیمی انجمن 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' تھی۔ جبکہ تحریک علی گڑھ نے قوم میں جوش و خروش پیدا کیا جس کی مثال انیسویں صدی میں ملنا مشکل ہے۔ اس تحریک میں جن سربرآوردہ شخصیتوں نے[3] سرسید کا ساتھ دیا، ان کے نام یہ ہیں: نواب محسن الملک (اصلی نام مہدی علی خاں

---

[1] 'آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس ۲۷ ر دسمبر ۱۸۸۶ء کو علی گڑھ میں ہوا۔ کئی اجلاس منعقد ہوتے رہے ایک سالانہ اجلاس ہز ہائی نس سر آغا خاں کی صدارت میں دہلی میں ۲۷ ر دسمبر ۱۹۰۲ء سے ۴ ر جنوری ۱۹۰۳ء تک ہوا۔ اجلاس کے ممبروں کی تعداد ۱۰۳۶۱ اور وزیٹروں کی تعداد ۳۱۰ تھی جنھوں نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ (پنجاہ سالہ تاریخ، ص ۸۸۔۸۹) اس وقت تک کانفرنس کے تین شعبے تعلیم نسواں، تعلیمی مردم شماری اور مدارس تھے۔ دہلی اجلاس میں تین مزید شعبے سوشل ریفارم، ادبی شعبہ، امور متفرقات شامل ہوئے۔ (محمد معروف، سید۔ مضمون 'انجمن ترقی اردو، مختصر تاریخی جائزہ'، مشمولہ: رسالہ ادب و کتب خانہ، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۴۱)

[2] تاریخ آل انڈیا مسلم لیگ۔ سرسیدؒ سے قائدِ اعظمؒ تک: آزاد بن حیدر، طبع اول۔ کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۵۸

[3] مولانا ابوالکلام آزاد نے سرسید اور ان کے مصاحبین کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا: 'مرحوم سرسید اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا تھا، بل کہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے

(باقی بر صفحہ آیندہ)

ہے)، نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، نذیر احمد، مولوی زین العابدین، محمد اسمٰعیل خان، الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی۔

۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال کے بعد ان کے ساتھی ان کے کام کو جاری رکھتے ہوئے آل انڈیا سیاسی تنظیم بنانے کی مسلسل کوششیں کرتے رہے جس کی وجہ سے مسلمان راہنما ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے۔[1]

سرسید کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے مذکورہ بالا حضرات کی تحریریں، مضامین اور تقاریر جو تہذیب الاخلاق وغیرہ میں شائع ہوئیں وہ اس کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ تعلیمی کانفرنس کے اجلاسوں میں پڑھے جانے والے خطبات (اور ان میں پاس ہونے والی قراردادیں) جو چالیس بیالیس سالوں پر محیط ہیں ۱۹۲۷ء میں مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر کی تحریک پر مولوی انوار احمد صاحب زبیری (مارہروی) نے خطبات عالیہ کے نام سے تدوین و ترتیب دیے۔ یہ خطبات علی گڑھ سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر اہتمام شائع ہوئے۔ خطبات کے مقدمہ میں مولانا محمد اکرام اللہ خاں ندوی[2] شاہجہانپوری (م: ۱۹۵۲ء) لکھتے ہیں: 'ابتدا میں لوگ زیادہ تر سرسید، نواب محسن الملک، مولانا حالی، مولانا نذیر احمد

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور ان کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی قابل ذکر اہل قلم ایسا ہوگا جو اس مرکزی حلقہ کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جدید ہندوستان کے بہترین مسلمان مصنف اسی حلقہ کے زیر اثر پیدا ہوئے اور یہیں نئے قسم کی اسلامی تحقیق و تصنیف کی راہیں پہلے پہل کھولی گئیں۔' (حوالہ: سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے از پروفیسر خلیق احمد نظامی، طبع بھارت۔ ۱۹۹۳ء، ص ۳۰ اور ۱۳۷، ۱۳۸)

[1] تاریخ آل انڈیا مسلم لیگ۔ سرسیدؒ سے قائد اعظمؒ تک، ص ۸۳، ۸۴

[2] بقول مولوی انوار احمد زبیری، مولانا اکرام اللہ خاں ندوی عربی ادب کے ذوق آشنا اور زبان اردو کے پختہ کار ناثر (مضمون نگار) ہیں: مولانا سلیمان اشرف نے ۱۹۲۳ء میں جب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے نصاب تعلیمات اسلامیہ کے لیے تجاویز مرتب کیں، تو ندوی صاحب موصوف نے اس کی تحسین کی اور عربی علم ادب کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے اُسے مفید و منفعت رساں قرار دیا۔ (التسہیل: ۳۰)

اور علامہ شبلی جیسے یگانۂ روزگار مشاہیر کے دیکھنے اور اُن کا لکچر یا کلام سننے کے لیے آتے تھے......

۱۸۹۳ء میں جب کانفرنس کا آٹھواں اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا اور نواب محسن الملک صدر منتخب ہوئے تو خطبہ صدارت میں ایک خاص وسعت و شان پیدا ہو گئی۔ یہ (گزشتہ اجلاسوں کی نسبت) سب سے پہلا خطبہ تھا جس میں زورِ بیان اور جوش پایا جاتا ہے اور انشا پردازی کی ایک خاص جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً نواب صاحب ایک موقع پر نکتہ چینوں کے جواب میں فرماتے ہیں:-

"مانا کہ ہم نے مغربی علوم کا شوق دلا کر مسلمانوں کو خراب کیا۔ مانا کہ ہم نے انگریزی تعلیم و تربیت کے جاری کرنے سے الحاد پھیلایا۔ مانا کہ ہم نے کانفرنس قایم کر کے مسلمانوں کو بہکایا، مگر ہم پر طعنہ کرنے والے خدا کے لیے یہ بتا دیں کہ اُنھوں نے اپنی قوم کے لیے کیا کیا، اور اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے بچانے میں کون سی کوشش کی؟ اگر ہم نے مسلمانوں کے لیے دیر و کنشت بنایا، مانا کہ گناہ کیا۔ مگر یہ فرمایئے کہ اُن کا بنایا ہوا بیت المقدس کہاں ہے جہاں جا کر ہم سجدہ کریں؟ اگر ہم نے اپنے بھائیوں کے واسطے ایک قومی کانفرنس قایم کی، ہم قبول کرتے ہیں کہ ایک بے سود کام کیا۔ مگر ہمارے دوست براہ مہربانی یہ فرما دیں کہ اُنھوں نے قوم کے حال پر مرثیہ پڑھنے، قوم کی مصیبت پر ماتم کرنے پر کون سی مجلس بنائی ہے کہ ہم وہیں جا کر نوحہ کریں اور سر پیٹیں؟ ہم اگر مضر یا بے سود کام کرنے کے گنہ گار ہیں، تو قوم کو مرتے دیکھنے اور کچھ نہ کرنے کا ذمہ دار کون ہے۔

گر دُسرِ تو گشتن و مُردن گناہِ من — دیدن ہلاک و رحم نہ کردن گناہ کیست

گیرم کہ وقتِ ذبح طپیدن گناہِ من — دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست"[1]

محمد سرور مرحوم (استاذ تاریخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ) فرماتے ہیں:

[1] آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ صدارتی خطبات (۱۸۸۶ء۔۱۹۰۶ء) مرتبہ آغا حسین ہمدانی۔ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد۔ ۱۹۸۶ء، ص ۸۴۔۸۲

"سرسید ہماری قوم کی ملی زندگی کے خالق ہیں[1]۔ ان کے جانشینوں نے اپنے مرشد کے بتائے ہوئے رستے پر بڑے خلوص اور سرگرمی سے قوم کو چلایا، محسن الملک اور وقار الملک نے مدرستہ العلوم اور ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعے ہم میں زندگی کا احساس اور جمعیت اور مرکزیت کا شعور قوی کیا۔ ان بزرگوں کی کوششوں سے اسلامی ہند کے مردہ جسم میں تازہ خون زندگی دوڑا اور ملت اسلامیہ نے نیا جنم لیا" [2]

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام (آل انڈیا مسلم لیگ کی پیش رو):

سیاسی سطح پر مسلم لیگ کے قیام سے پہلے مسلمانانِ ہند بجا طور پر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ہی کو سب سے بڑا سیاسی پلیٹ فارم سمجھتے تھے۔ مسلمان زعما و اکابر اس کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں شامل ہوتے رہے اور اپنا عملی کردار بھی ادا کرتے رہے۔ بالفعل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے آل انڈیا کانگریس کے مقابلے میں اہم کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب ہندی اردو تنازع[3] شروع ہوا تو ایجوکیشنل کانفرنس کے زعما نے مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ سیاسی جماعت بنانے پر غور و خوض شروع کر دیا تھا۔

[1] "اگر سید احمد خاں مرحوم و مغفور مسلمانوں کو دوبارہ علمی ذوق اور جستجو سے آشنا نہ کرتے تو یہ ملک جس میں ہم آزادی کا سانس لے رہے ہیں اس کا قیام ناممکن ہوتا۔ نہ ہمارے پاس اقبال ہوتے نہ جناح۔ نہ ہمیں اپنے ماحول کا فہم ہوتا نہ ہم بدلتے ہوئے حالات میں اسلام کے تقاضوں کو سمجھ سکتے چہ جائیکہ اپنے ملی مفاد کا تحفظ کر سکیں۔ بالا کوٹ اور دہلی کی شکستوں کے بعد اگر کسی چیز نے ہماری گرتی ہوئی قوم کو سنبھالا تو وہ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک تھی۔ علی گڑھ نہ ہوتا تو پاکستان بھی نہ ہوتا ...... پاکستان کی بنیاد ایک تعلیمی تحریک پر ہے اور ایک تعلیمی تحریک ہی اسے قوت اور عظمت بخش سکتی ہے۔" (ممتاز حسن، ڈاکٹر، "مقالاتِ ممتاز"، مشمولہ "تعلیم: ایک ناگزیر فریضہ"۔ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ۲۸۰)

[2] محمد سرور، پروفیسر۔ مقدمہ: "مضامینِ محمد علی"۔ مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۳۸ء، صفحہ "ب"

[3] ہندوؤں کی جانب سے اُردو کے خلاف یہ تحریک علمی و ادبی کے بجائے ایک سیاسی تحریک تھی جس کا مقصد وحید ہندوستان سے مسلم تہذیب کی تمام نشانیوں کو یکسر ختم کرنا تھا۔ مسلمانوں کی الہامی کتاب قرآن کریم کے ساتھ خود ہندو کانگریسی لیڈر مسٹر گاندھی کی دشمنی اس حد تک تھی کہ وہ کہتے تھے "میں اردو بھاشا کا اس لیے مخالف ہوں کہ اس کے اکثر الفاظ قرآنی بھاشا میں ہیں"۔

(باقی بر صفحہ آئندہ)

۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں مسلم ایجوکیشنل کا بیسواں سالانہ اجلاس نواب مشتاق حسین وقار الملک (۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء – ۲۷ جنوری ۱۹۱۷ء) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ شرکائے کانفرنس میں بحث و مباحث کے بعد اجلاس کے مندوبین کی اس تجویز کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے ایک علاحدہ سیاسی جماعت ہونی ضروری ہے۔ لہٰذا اس اجلاس میں اتفاق رائے سے آل انڈیا مسلم لیگ قائم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام یعنی دسمبر ۱۸۸۵ء کے بعد سے مسلمانوں کی سیاسی جماعت کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ نواب وقار الملک نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اوّلین تاسیسی اجلاس میں اپنے صدارتی خطاب میں یوں اظہار فرمایا:

"آنریبل نواب خواجہ سلیم اللہ خان بہادر اور دیگر حضرات! آج جس غرض سے کہ ہم لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں، وہ کوئی نئی ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستان میں جس وقت سے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی ہے، اس وقت سے وہ ضرورت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ سرسید مرحوم و مغفور نے جن کی عاقبت اندیشی اور عاقلانہ پالیسی کے مسلمان ہمیشہ مشکور و ممنون ہیں۔ نیشنل کانگریس کے بڑھتے ہوئے اثر سے متاثر ہو کر نہایت زور کے ساتھ اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کی بہتری اور حفاظت اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کانگریس میں شریک ہونے سے

(بقیہ صفحۂ گزشتہ)

تاہم علی گڑھ تحریک سے بقول ضیاءُ الدین اصلاحی، علم و ادب کا فروغ اور اردو زبان کی مفید خدمت انجام پائی۔ سرسید، نواب محسن الملک اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اردو زبان کے تحفظ و بقا کے لیے بھرپور کوششیں کیں۔ ۱۹۰۳ء میں اردو کی ترویج و ترقی اور حفاظت کے لیے "انجمن ترقی اردو" کا قیام عمل میں آیا۔ یہ انجمن، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ہی کی ایک شاخ تھی، جو آگے چل کر خود ایک بار آور درخت بن گئی اور تاریخ و تہذیب اور مسلم زبان اور کلچر کے ارتقا میں اس انجمن نے اہم کردار ادا کیا۔ (حصول پاکستان، ص ۵۱ اور ششماہی الایام، کراچی، جنوری۔ جون ۲۰۱۴ء، ص ۲۹)۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف "ہندی اُردو تنازع (ہندو مسلم سیاست کی روشنی میں)" شائع کردہ نیشنل بک فاؤنڈیشن دیکھی جا سکتی ہے۔

باز رکھیں[1]، اور یہ رائے اس قدر صائب تھی کہ گو جناب مرحوم آج ہم میں نہیں ہیں، لیکن مسلمانوں کی عام رائے اس وقت وہی ہے اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے، ہم کو اس بات کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے پولیٹکل حقوق کی حفاظت میں بیش از بیش اہتمام کریں۔[2]

پروفیسر احمد سعید نے اپنی کتاب "انجمن اسلامیہ امرتسر" میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے باب میں لکھا ہے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم کا قیام اگرچہ خالصتاً تعلیمی مقاصد کے لیے عمل میں آیا تھا،[3] لیکن اسی پلیٹ فارم سے سرسید نے کانگریس کے خلاف تقاریر کیں اور اسی پلیٹ فارم سے مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ

---

1. مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین شروع سے اب تک یہ اختلاف چلا آرہا تھا کہ کانگریس چاہتی تھی کہ پورے ہندوستان پر اس کا اقتدار ہو۔ وہ جس قسم کا قانون چاہے وضع کرے۔ تمام اقلیتیں اس کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ مسلم لیگ چاہتی تھی کہ دستور حکومت ایسا ہو جس میں مسلمانوں کو اپنے کلچر، زبان، تہذیب و تمدن، مذہب وغیرہ جیسے اہم معاملات میں پوری آزادی ہو اور وہ حکومت میں شریک ہو کر اپنی ملت کے حقوق پورے کرا سکیں۔ (بدایونی، عبدالحامد قادری، مولانا۔ "خطبۂ صدارت۔ پاکستان کانفرنس" مورخہ ۳۰ راگست ۱۹۴۱ء منعقدہ رائے کوٹ ضلع لودھیانہ، مطبوعہ نظامی پریس۔ بدایوں، ص ۲۳)
2. "تاریخ آل انڈیا مسلم لیگ۔ سرسیّد سے قائداعظم تک" مرتبہ آزاد بن حیدر، ص ۱۱۰۔
3. "ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے بقول، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس دراصل کانگریس کا ردعمل تھی۔ سرسید احمد خان نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان ہندوؤں کی طرح سے مغربی طرز سے اپنی زندگیوں کو ڈھال لیں اور برطانوی حکام کے تحت سیاست میں حصہ لیں، کیونکہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کی وجہ سے یہ امتیاز کرنا مشکل تھا کہ سیاست میں کس طرح سے حصہ لیں، لہٰذا بہتر یہی تھا کہ سیاست میں حصہ نہ لیا جائے۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے قومی تقاضوں کے تحت مغربی تعلیم کا انتظام کیا۔ بنگال سے لے کر سرحد اور پنجاب سے دکن تک کے مسلمانوں کو اپنی قومی اور اجتماعی تعلیم و ترقی کا احساس ہو گیا اور اسی بیداری کے نتیجہ میں آگے چل کر ملکی سیاست اور تحریک آزادی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ (ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا انٹرویو بمقام ان کی رہائش گاہ A-592, Block-J, North Nazimabad, Karachi بروز جمعرات مورخہ ۱۵ر نومبر ۲۰۱۲ء از کہکشاں ناز بحوالہ ششماہی الایام، کراچی، جنوری۔ جون ۲۰۱۳ء، مشمولہ: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں سید الطاف علی بریلوی کی خدمات (۱۹۳۵ء تا ۱۹۵۰ء)۔

معرض وجود میں آئی۔[1] ہمارے عہد کے مستند دانشور خواجہ رضی حیدر کی رائے ہے کہ مسلمانوں میں عام بیداری پیدا کرنے میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بہت مفید ثابت ہوئی۔[2]

مسلم لیگ کو بلاشبہ بہ حیثیت جماعت بلکہ تحریک، پاکستان بنانے کا منفرد اعزاز حاصل ہے، لیکن یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلم لیگ نے بالفعل آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بطن سے جنم لیا، تو پھر اس کے فعال کردار کا اعتراف کیوں نہ کیا جائے۔

وابستگانِ علی گڑھ کا مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے ساتھ والہانہ تعلق خاطر

آج اگر مورخین اس حقیقت کے معترف نظر آتے ہیں کہ تحریک پاکستان کو عملاً دست و بازو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے طلبہ نے عطا کیے تو اس کا کامل ادراک اس وقت بھی علی گڑھ والوں کو بصمیم قلب و جاں تھا۔ اور وہ بالفعل اپنے خون جگر سے اس ملی تحریک کی آبیاری میں جٹے رہتے تھے۔

آیئے رسالہ سہ ماہی علی گڑھ جلد ۲۲، شمارہ نمبر ۱، ۱۹۴۶ء کا ایک شذرہ ملاحظہ فرمایئے۔

"علی گڑھ ہندوستان میں مسلم قوم کا سرچشمۂ فکر و عمل اور ان کی ملی زندگی کا آئینہ ہے۔ اس چند مربع میل سرزمین میں دس کروڑ انسانوں کی روح اور قلب و ذہن کی پہنائیاں بند ہیں۔ یہیں پہنچ کر ہندوستان کے "مرد بیمار" کو پہلی بار امید کی کرن نظر آئی اور "خونِ صد ہزار انجم" سے نمودِ سحر کے آثار پیدا ہوئے یہیں سے تعلیمی اور مابعد معاشری اصلاح کا دور شروع ہوا اور یہیں سے اور یہیں کی اصلاحات کے بطن سے ۱۹۰۶ء میں سیاست نے مسلم لیگ کی شکل میں جنم لیا۔ یہیں سے خلافت کی آواز اٹھ کر پورے ہندوستان میں گونجی اور یہیں کے مجاہدوں نے اُس نازک وقت میں جناح کے گرد جمع ہو کر مسلم قوم کو بچا لیا، جب کانگریس اسے اپنے میں ضم کر لیتا یا بالفاظ دیگر اس چراغ کو اپنے دامن میں چھپا کر گل کر دیتا

---

1. انجمن اسلامیہ امرتسر (۱۸۷۳ء۔۱۹۴۷ء) تعلیمی و سیاسی خدمات از احمد سعید، مطبوعہ ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۶۳۔
2. قائداعظم کے ۷۲ سال، سورتی اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۷۔

چاہتی تھی۔ جہاں کی یہ تاریخ ہو وہاں یہ کس طرح ممکن تھا کہ قوم پر آزمائش کا وقت آپڑے اور خاموشی رہے۔ چناں چہ جب ہنگامہ انتخابات شروع ہوا اور قوم کو ضرورت ہوئی تو یہاں کے فرزند قوم کے مفاد پر اپنے مفاد، اور قوم کے مستقبل پر اپنے مستقبل کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ ہزاروں اسرافیل نے کراُٹھے اور موت کی سی نیند سونے والوں کو بھی جھنجوڑ جھنجوڑ کر اُٹھا دیا۔ قریوں قریوں پھرے اور گلیوں گلیوں کی خاک چھانی کہیں صرف اپنی جیب کے چنوں پر گزارا کیا اور کہیں کڑکڑاتی سرد راتیں اپنی سیاہ شیروانیوں کے سہارے کھلے میدانوں میں گزار دیں۔ مشکل سے ہندوستان کا کوئی ایسا مسلم آباد گوشہ ہوگا جہاں ان کے قدم نہ پہنچے ہوں اور موذن کی صداؤں سے آشنا کم ایسی بستیاں ہوں گی جہاں ان کی آواز نہ گونجی ہو۔ کہیں کہیں تیس تیس، چالیس چالیس میل کی مسافت بیک وقت پیادہ پا طے کی اور کہیں بیمار پڑے تو غربت و کس مپرسی میں بھی اپنے رفیقوں کو حکم کار دے کر رخصت کر دیا۔ بالآخر اس جذبۂ ایثار و خلوص عمل کو کامل فتح ہوئی اور دنیا کو معلوم ہو گیا کہ مسلم لیگ مسلم قوم کا پیکر اور پاکستان اس کی روح ہے۔" [1]

علی گڑھ کا طلبہ محاذ قائداعظم کی نظر میں

علی گڑھ والوں کی تحریک پاکستان اور قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ محبت یک طرفہ یا محض وقتی جذبات کی آئینہ دار نہ تھی۔ نہ ہی یہ چاہت اور خلوص یک طرفہ تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح کو نوجوانان علی گڑھ کی محبت کا حد درجہ پاس تھا اور وہ اپنے ان جاں نثاروں کی دل جوئی اور سرپرستی کو اپنے اوپر لازم جانتے تھے۔ ذیل میں ان کے خیالات کی ترجمانی کرتی ایک تحریر دیکھیے۔

"علی گڑھ میری تحریک کا مرکز ہے، یہیں سے میرے نوجوان سفیر براعظم ہندوستان کے ہر کونے میں جا کر مسلمان عوام کو مسلم لیگ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ ان کا مشنری

---

۱ سہ ماہی "علی گڑھ میگزین" ۱۹۴۶،۴۷ء۔ اداریہ شذرہ بعنوان: مادر درس گاہ، صفحہ ط اور ی۔

جذبہ اور تحریک سے بے لوث لگاؤ ہی میری ساری متاع ہے۔ میں علی گڑھ دس کام چھوڑ کر آتا ہوں اور ان بچوں کی صحبت میں بیٹھ کر اور ان سے باتیں کر کے اپنے عزم اور ارادے میں تقویت حاصل کرتا ہوں۔" [1]

تحریک پاکستان کے سنگ ہائے بنیاد میں ایک اہم ترین نام آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

پاکستان کے تخیل کو ایک زندہ حقیقت بنانے کے لیے جو جاں گسل اور پیہم جدوجہد ہمارے اکابر نے کی، اس سعی جمیل میں ایک اہم ترین کارنامہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا وجود میں لانا ہے۔ اس کتاب کے مختلف ابواب میں انتہائی شرح و بسط کے ساتھ اس ادارہ کی اہمیت و افادیت اور گراں قدر خدمات کا اظہار کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں جہاں جہاں سے بھی کوئی قابل ذکر اور قابل قدر مواد میسر آیا اسے کتاب کا حصہ بنایا گیا کہ قارئین کرام زیادہ سے زیادہ تاریخی حقائق تک رسائی حاصل کر سکیں۔

حُسن اتفاق سے جناب افضل عثمانی کا ایک مفید اور مستند مقالہ ہمارے ہاتھ آیا، جو ہم من و عن بزبان انگریزی ہی شامل کتاب کر رہے ہیں۔

---

۱ "علی گڑھ اور تحریک پاکستان": نواب مشتاق احمد خاں، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، اگست ۱۹۶۹ء، بحوالہ کرامت علی خاں: "جہاد آزادی (منتخب مقالات)" مطبع لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۱۔

All India Muslim Educational Conference

سلطان جہاں منزل (مرکزی دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) کا اندرونی منظر

All India Muslim Educational Conference Head Office (Sultan Jahan Manzil, AMU Aligarh India)

By <u>Afzal Usmani</u>

All India Muslim Educational Conference (AIMEC), a Non-political organization which brought Muslim rulers of remaining princely states of undivided British India, social and political leaders, intellectuals and distinguished people from all of walks of life onto one platform for educational empowerment of Muslims of India and transformed the dimensions of Aligarh Movement and fulfilled the dream of its founder, Sir Syed Ahmad Khan by converting Muhammadan Anglo Oriental College (M.A.O. College) to Aligarh Muslim University. The Conference also became championing the cause of Women's education and gave birth to one of the oldest and biggest women's educational institution, Women's College of Aligarh. This non-political, All India Muslim Educational Conference which was started for educational empowerment of Muslims of India also gave birth to largest Muslim political party "Muslim League" which still has roots in all the 3 countries of British India, Pakistan, Bangladesh and India. This one time conglomerate of Muslim Intelligentsia of British India has lost its glory and living or dying quietly in a monumental and historical building

"Sulatn Jahan Manzil" in Aligarh Muslim University campus. The only time we hear its name when it sends 5 representatives to Aligarh Muslim University supreme governing institution AMU Court or get a peek into its symbolic lowest possible subscribed Journal, "Conference Gazette". Let's have a look, what was All India Muslim Educational Conference.

The inauguration of first Session of Indian national Congress at Bombay on 28-31 December 1885 by Allan Octavian Hume was a turning point in social and political movements of British India. Indian National Congress chooses a path of confrontational politics with the rulers of British India which was against the philosophy of Sir Syed Ahmad Khan, who was a strong supporter of Co operational Politics with British Empire. This lead Sir Syed to establish Mohammadan Educational Congress on 27th December, 1886 at Aligarh. By this time Sir Syed was undisputed well wisher of Muslims of India and had unquestioned secular credentials. Sir Syed's decision not to participate in Indian National Congress surprised a lot of intellectuals of the time. But Sir Syed was very clear in his mission of Muslim upliftment and at any cost he did not wanted to see the wrath of British Empire on Muslims of India which he had himself witnessed after 1857 revolt and so he choose the path of Co operational Politics with the rulers of India. This Congress became Mohammadan Educational Conference in the annual session of 1890 at Allahabad. This organization was a key element of Aligarh Movement and played an important role in taking the Aligarh Movement across the Indian Sub-continent and the establishment of Aligarh Muslim University. It is an established fact that the foundation of AIMEC was to keep Muslims of India away from a confrontational politics of Indian National Congress against British Empire and to do so it was made very clear that AIMEC is socio-political group to promote education among the Muslims of Indian subcontinent. One of the demands of the INC was to have open competition for Civil Services. Sir Syed was convinced that Muslims of India are educationally not at par with their fellow countrymen and so can not compete in open competition with their fellow countrymen. Sir Syed and leaders of AIMEC made it very clear that AIMEC is neither against INC or other political groups of India nor intended to alienate Indian Muslims from main stream political process but to promote education among the Muslims of Indian subcontinent to bring them at par with their fellow countrymen. In the Inaugural session of Muslim Educational Conference on 27th December, 1886 at Aligarh, Sir Syed emphasized his philosophy of co operational politics with the rulers of India and put forward the need of educational

empowerment for the Muslims of India. Indian National Congress leaders were not very happy with the formation of Muslim Educational Conference.

Muslim Educational Conference was concern primarily with Muslim education. It kept a vigilant eye on the spread of modern education among Muslims and passed resolutions and took steps to deal with the factors which were hindering its progress. Muslim Educational Conference became a platform for Indian Muslim Intelligentsia to mobilize Indian Muslim masses to promote education and specifically modern and western education and clear their doubts and misconception about the western and modern education. The Conference was much more than a gathering of Muslim Educationist and gave an opportunity to Aligarh Movement leaders to promote Aligarh Movement. Principal Theodore Beck and Prof. Theodore Morrison also took keen interest in Conferences activities. Sir Syed Ahmad Khan was elected as Secretary of the newly formed organization. The Conference was a powerful instrument of Intellectual awakening and general spread of knowledge amongst the Muslims of India.

The life of All India Muslim Educational Conference can be broadly divided in five phases or periods;

1. 1886-1898 : Sir Syed Period
2. 1898-1907 : Mohsinul Mulk Period
3. 1907-1917 : Sahabzadah Aftab Ahmad Khan Period
4. 1917-1947 : Nawab Sadar Yar Jang Period
5. 1947-till date : Post Independence period

1886-1898: Sir Syed Period:

The Beginning a new Conglomerate of Muslims of India:

The first session of Muslim Educational Conference (AIMEC) was held at Aligarh. This inaugural session was presided over by none other than close friend of Sir Syed and one of the strongest supporters of Aligarh Movement, Maulvi Samiullah Khan. In this session, Sir Syed Ahmad Khan was elected as Secretary of the newly formed organization. The Inaugural session at Aligarh adopted the following resolutions;

1. Establishment of "AIMEC" and to hold its annual session in different parts of the country.P
2. British Government should only take care of modern and western education. Muslims will take care of Oriental studies.
3. Promote publications of journals and special attention should be paid for memorization of Quran (Hifz-e-Quran)
4. The Head Office of Muslim Educational Congress will be at Aligarh.

The second session of The Congress was held at Lucknow and was presided over by Mr. Imtiyaz Ali Khan of Kakori. The session adopted the following resolutions;

1. Scholarships will be awarded to Muslim students for higher education.
2. Local Educational Committees were formed.

The first two sessions of The Congress were focusing on education but the Third session which was held at Lahore in 1888 focused on social issues of Muslims of India. The session was presided by Sardar Muhammad Hayat Khan and the following resolutions were adopted;

1. Voice was raised against some heinous and Non-Islamic traditions among the Muslims and solutions were discussed to curb these Non-Islamic and heinous traditions from the Muslim societies.
2. Request was made to the government for concessions and exemptions on tuition fees for poor Muslim students.
3. Oriental and religious education should be started in Government Schools.
4. An extra effort needs to put for promotion of women's education.

The Fourth session was held at Aligarh in 1889 and was presided over by Sardar Muhammad Hayat Khan and following points were discussed;

1. A passionate appeal was made to donate Zakat Money for the education of poor Muslim students.
2. Demands were made to remove derogatory and anti-Islamic contents from History course books.
3. Proposals were made to establish separate technical institutes.
4. Special attentions were paid towards the need to develop curriculum for toddlers and kids.

The Fifth session was held at Allahabad in 1890 and once again it was presided by Sardar Muhammad Hayat Khan. The major attraction of this session was the renaming of All India Mohammadn Educational Congress to All India Muslim Educational Conference. The other focus of this session was translation of literary works of different languages into Indian languages. The marching mode of this caravan of Muslim intellectuals of India was well received by the Indian Muslims and its resolutions and

proposals started showing some results. The Sixth session at Aligarh recognized appreciated the efforts of Shamsul Ulema, Allama Shibli Nomani for his writings "Al-Jizya (Security Tax for Non-Muslims in Islamic State), Al-Mamoon (Biography of Khalifa Mamoon Al-Rasheed) and Seeratun-Noman (Biography of Imam-e-Azam, Abu Hanifa) ". This session also recognized the need of women education for the overall development of Muslims of India. Some concrete steps were proposed to promote women education. Publication of "Conference Journal "was a baby of this Aligarh session. This historical session at Aligarh was presided over by Nawab Ishaq Khan, who later served as Secretary of Mohammadan Anglo Oriental College Management. The Sixth session was held at Delhi in 1892 and faced some stiff resistance from some local theologians. This session was presided over by Maulvi Hashmatullah Khan. This session was also addressed by M.A.O. College Principal, Prof. Theodore Beck and M.A.O. College Professor and well known Orientlist, Prof. Thomas Walker Arnold. The session of 1894 at Aligarh also made a passionate appeal to support the newly formed organization "Nadwatul Ulema".

In 1896, the annual last executive session of Muslim Educational Conference in Sir Syed Ahmad Khan's lifetime, made a proposal to start a women education section in Muslim Educational Conference was accepted and Justice Karamat Hussain was appointed as its Founding Secretary. Nawab Mohsinul Mulk, Sahabzada Aftab Ahmad Khan, Janab Sultan Ahmad and Haji Ismail Khan were asked to assist Justice Karamat Hussain. In the annual session of Muslim Educational Conference of 1898 in Lahore, a separate department of women's education was established and Sahabzada Aftab Ahmad Khan was elected its Secretary. This started a wrath from the traditional Muslims of India but a dedicated team of Janab Ummid Ali, Ghulam-us-Saqlain and Haji Ismail Khan wrote several letters and article in Aligarh Institute Gazette and other reputed journals to defend the decision of Muslim Educational Conference to start a women's educational movement. Justice Amir Ali presided over the annual session of AIMEC in 1899 at Calcutta and the idea to start girl's schools is all of the state capital was accepted. It was also agreed that the Ulema will be consulted to develop the curriculum of the schools and the modern subjects of Science and Social Science will also be included the syllabus. In the session of December 1902 in Delhi under the leadership of H.H. Sir Agha Khan, young Shaikh Abdullah was appointed as Secretary to look into the women's educational project and was asked to start the activities very aggressively. The year 1897 was a bit tough on AIMEC as could not held the annual session due to poor

health complication with Sir Syed Ahmd Khan and finally Sir Syed Ahmad Khan died on 27th March 1898 and the rein of All India Muslim Educational Conference were transferred to Saiyad Mehdi Ali, Nawab Mohsinul-Mulk. By this time AIMEC had became an effective and established platform and even the opponents of Sir Syed including Justice Amir Ali, Justice Badruddin Tayabji and many more had joined the AIMEC and had started attending AIMEC sessions in different parts of the Country. The Brirish staff of MAO College including Principal Theodore beck, Prof. T. Morrison, Prof. T.W. Arnold and others started supporting the AIMEC in India and started a campaign to generate support in England too.

1898-1907: Mohsinul Mulk Period:

The Beginning of Movement for a Muslim University and Birth of Muslim League:

The death of Sir Syed was a tragic event for Aligarh Movement and its leaders but to fulfill the mission of Sir Syed, his close confident and friend and one of the strongest supporter of Aligarh Movement, Saiyad Mehdi Ali, Nawab Mohsinul Mulk was elected as Secretary of M.A.O. College Management Committee as well as Honorary Secretary of All India Muslim Educational Conference. Colleges everywhere were feeling the pinch of the government's demands for higher fees and harder examinations. At Aligarh, the number of students fell from 595 in 1895 to 323 at the time of Sir Syed's death on 27 March 1898, and by the following July had plummeted to 189; and the situation was made worse by an embezzlement scandal in 1895, and by renewed attacks from Sir Syed's old collaborators who had broken with the college in 1889. The college accounts were in disorder, and as a result of embezzlement, the suspension of grants from a number of benefactors, and the fall in income from fees, the institution was heavily in debt. [6].

This was a very tough time for MAO College and Aligarh Movement but after taking over the rein of Aligarh Movement, Nawab Mohsinul Mulk gave a big boost to fulfill the dream of Sir Syed Ahmad Khan to convert M.A.O. College into a Muslim University and in the first session during his Secretary ship in 1898 at Lahore, he pushed forward the proposal of Muslim University. The proposal was prepared by Prof. T. Morrison and Maulvi Badrul Hasan. This session of AIMEC also put emphasis on moral education for youth and special attention were paid to promote women's education

The following proposals were made in the 12th session of AIMEC at Lahore, which was first session after the death of Sir Syed Ahmad Khan.

1. Proposal for a Muslim University.
2. Promotion of Women's Education.
3. Promotion of moral education for youths
4. Establishment of Muslim Hostels at Public or Private Institutions.

This session at Lahore was presided over by Nawab Fateh Ali Khan Qazalbash. The proposals for a Muslim university were fully discussed at this session at Lahore in December 1898. About 900 people attended and the Conference showed a new spirit of enterprise. Prof. T. Morison proposed that a Muslim university should be founded, observing that it would really be no more than an expanded version of Aligarh College. Beck reminded the audience that the University would be the Indian Muslims' passport to office. Badruddin Tyabji of Bombay, Sir Syed's old political antagonist, subscribed Rs. 2,000 to the university, and, from Calcutta, Syed Amir Ali pledged his support. In December 1899, the conference moved out of upper India and met in Calcutta under the presidency of Amir Ali. The Sir Syed memorial fund started a Bengal branch. The 1901 session of the conference took place in Madras. The following year, the Aga Khan presided over the meeting in Delhi, and in 1903 the Conference was held in Bombay under Badruddin Tyabji. Badruddin Tyabji, speaking as president of the 1903 Muhammadan Educational Conference, described the plans for a university as premature. Muslims should first lay a strong foundation of local Muslim schools and colleges which, initially at least, could be affiliated to the existing government universities.49 Akbar Hydari, Tyabji's nephew, spoke out against the whole idea of a Muslim university.50 Hydari argued that for secular advancement Muslims would be better off at the existing universities. Serious theological training was adequately provided in existing madrasas. Moreover, it would be foolhardy to bring the doctrines of different Muslim sects into open rivalry at one centre. At a regional meeting of the Educational Conference in Ahmadabad in October 1904, Muhammad Ali, younger brother of Shaukat Ali, replied to Hydari in an eloquent restatement of the Beck-Morison concept of a Muslim university.52 He called upon his experience at Aligarh and Oxford to argue for 'the expansion of Aligarh'. Muhammad Ali projected a bold view of India as a 'federation of religions'; only if Muslims and Hindus were allowed to cultivate their distinctive cultural traditions could they live together amicably. Therefore both the Muslim university at Aligarh and the Hindu university at Benares, proposed earlier in the year by Pandit Madan Mohan Malaviya, should be encouraged.

Professing 'no concern with politics, and certainly no desire to confound it with education', Muhammad Ali none the less warned that government educational policy must respond to the wishes of the people. The idea of a Muslim university had been generated by a popular movement: 'Aligarh is the people's very own.' Wider participation, however, also meant a greater variety of ideas about the university; if Aligarh was to ask for money from such far-off places, it had to offer something in return. To scores of meetings Mohsin ul-Mulk and others held out the image of Aligarh as the best hope of the Indian Muslims, the restorer of past greatness. The university was becoming a symbol of a reviving Islam. [6].

The other sessions were held at, Rampur (1900, Maulvi Syed Husain Bilgirami), Lucknow (1904- Prof. T. Morrison) and Aligarh (1905- Khalifa Mohd. Hussain). The major highlights of these different sessions were promotion of Science, law and other modern education at M.A.O. College and promotion of Women's education and establishment of Girls School at Aligarh and establishment of Fund for M.A.O. College. MAO College affairs as well as AIMEC were demanding more time and resource and it became tough for Secretary of MAO College management Nawab Mohsinul Mulk to do a balance of commitment for MAO College and AIMEC, than a staunch supporter of Aligarh Movement Sahebzadah Aftab Ahmad Khan was appointed as founding Jt. Secretary of AIMEC in the annual session of 1905 at Aligarh.

Dhaka Session of 1906 and Birth of Muslim league:

Even though the official publication of All India Muslim Education Conference "Muslim Educational Conference kay 100 Saal " does not talk about the this session due to one or the other reasons but it is almost very clear that the 1906, Dhaka session of All India Muslim Educational Conference was the birth place for "All India Muslim League". In the early October 1906 All India Muslim Educational Conference leaders and few others met Viceroy of India at Shimla and discussed some of their concerns. Nawab Khwaja Salimullah of Dhaka could not join the deputation due to his cataract operation [2]. The omission of Division of Bengal issue from the discussion or unsatisfactory response from the Viceroy made young Nawab Khwaja Salimullah unhappy and he proposed an All India Muslim Educational Conference to be held in Dhaka, capital of the then East Bengal and Assam Province in the year 1906. The conference was inaugurated on 27

December 1906 and continued till 29 December 1906 as Conference on Education. The inaugural session was chaired by Nawab Justice Sharfuddin, the newly appointed justice of Calcutta High Court. On 30 December 1906 political session of the conference took place. It was chaired by Nawab Viqar-ul-Mulk. In this session a motion to form an All India Muslim League (AIML) was proceeded. Initially a party styled as All India Muslim Confederacy was discussed. But, in the process the name All India Muslim League, proposed by Nawab Khawaja Sir Salimullah Khan Bahadur and seconded by Hakim Ajmal Khan, was resolved in the meeting. All delegates were registered as members of the proposed party led by Janab Muhsin-ul-mulk and Janab Viqarul Mulk, who were Joint Conveners. AIML was first Muslim political party in the history of India. A total of 1955 delegates attended the event. The conference was attended by most of the Muslim zamindars, educationists, pleaders, and other leaders of the community.

1907-1917: Sahabzadah Aftab Ahmad Khan Period:

AIMEC and Muslim University Movement

Sahebzadah Aftab Ahmad Khan was officially Joint Secretary of All India Muslim Educational Conference and Secretary of M.A.O. College management Committee, Nawab Mohsinul Mulk, Nawab Viqarul Mulk and Nawab Ishaq Khan remained Secretary of AIMEC during this time of 1905-1917 but their pre-occupation with MAO College affairs gave young and energetic Aftab Ahmad Khan almost absolute freedom to give AIMEC a new direction. This 12 year reign of Sahebzadah Aftab Ahmad Khan gave AIMEC a new direction and took it to a new peak and AIMEC became a reckoning force of Muslims of India. It also took interest in local issues of the place where annual session is held and attentions were paid to help and support local community to over come their social and educational problems. He also expanded the perimeter of AIMEC and its annual session was held even in Rangoon in 1909. During this time the annual sessions were held at Karachi (1907- Altaf Hussain Hali), Amritsar (1908- Sir Khawaja Salimuddin of Dhaka), Rangoon (1909- Sir. H.H. Nawab Mohd. Ali, raja of Mahmudabad), Nagpur (1910- Abdullah Yusuf Ali, Principal of Islamia College of Lahore and famous English translator of Quran), Delhi (1911 – Emadul Mulk Syed Hussain Bilgirami), Lucknow (1912- Major Syed Hasan Bilgirami), Agra (1913- Justice Shah Deen), Rawalpindi (1914, Maulvi

Rahim Bakhsh), Pune (1915, Justice Abdul Rahim), Aligarh (1916- Miyan Mohd. Shafi), Calcutta (1917, Nawab Sir Haider Nawaz Jang Bahadur Mohd Akbar Ali).

The plan for the Muslim University had by 1910 taken on the complexion and force of a national movement. The session of the All India Muslim Educational Conference at Nagpur in December, 1910 was presided by Abdullah Ibn Yusuf Ali Khan. In his address Sir Aga Khan gave the signal for a concreted, nation-wide effort to raise the necessary funds for the projected University. In moving the resolution on the University, the Aga Khan III made a stirring speech. He said, "This is a unique occasion as His Majesty the King-Emperor is coming out to India. This is a great opportunity for us and such as is never to arise again during the lifetime of the present generation, and the Muslims should on no account miss it. We must make up and make serious, earnest and sincere efforts to carry into effect the one great essential movement which above all has a large claim on our energy and resources. If we show that we are able to help ourselves and that we are earnest in our endeavors and ready to make personal sacrifices, I have no doubt whatever that our sympathetic government, which only requires proper guarantees of our earnestness, will come forward to grant us the charter. 'Now or never' seems to be the inevitable situation." To make a concerted drive for the collection of funds, a Central Foundation Committee with the Sir Aga Khan III as Chairman with Maulana Shaukat Ali (1873- 1938) as his Secretary; and prominent Muslims from all walks of life as members was formed at Aligarh on January 10, 1911. The Aga Khan III accompanied by Maulana Shaukat Ali, who was still in government service and had taken a year's furlough, toured throughout the country to raise funds, visiting Calcutta, Allahabad, Lucknow, Kanpur, Lahore, Bombay and other places. Willi Frischauer in his book, The Aga Khans writes, "His campaign for the Aligarh University required a final big heave and, as Chairman of the fund raising committee, he went on a collecting tour through India's main Muslim areas: 'As a mendicant', he announced, 'I am now going out to beg from house to house and from street to street for the children of Indian Muslims.' It was a triumphal tour. Wherever he went, people unharnessed the horses of his carriage and pulled it themselves for miles"[4]. The response to the touching appeal of the Sir Aga Khan III was spontaneous. On his arrival at Lahore, the daily "Peace" of Punjab editorially commented and called upon the Muslims "to wake up, as the greatest personality and benefactor of Islam was in their city." The paper recalled a remark of Sir Syed Ahmad Khan prophesying the rise of a hand from the unseen world to accomplish his

mission. "That personality" the paper said, "was of the Sir Aga Khan III." On that day, the "London Times" commenting upon the visit, regarded him as a great recognized leader of Muslims. Allama Shibli Nomani was with Sir Aga Khan in the delegation for fund raiser to Lahore. Shibli recited a very passionate Persian poetry to motivate the audience for fund raiser. The significant aspect of the Aga Khan's fund collection drive was not the enthusiastic welcome accorded to him, but the house to house collection drive. Qayyum A. Malick writes in his book "Prince Aga Khan" that once the Aga Khan on his way to Bombay to collect funds for the university, the Aga Khan stopped his car at the office of a person, who was known to be his bitterest critic. The man stood up bewildered and asked, "Whom do you want Sir?" "I have come for your contribution to the Muslim university fund," said the Aga Khan. The man drew up a cheque for Rs. 5000/-. After pocketing the cheque, the Aga Khan took off his hat and said, "Now as a beggar, I beg from you something for the children of Islam. Put something in the bowl of this mendicant." The man wrote another cheque for Rs. 15000/- with moist eyes, and said, "Your Highness, now it is my turn to beg. I beg of you in the name of the most merciful God to forgive me for anything that I may have said against you. I never knew you were so great." The Aga Khan said, "Don't worry! It is my nature to forgive and forget in the cause of Islam and the Muslims." The drive received further great fillip from the announcement of a big donation of one lac rupees by Her Highness Nawab Sultan Jahan Begum of Bhopal. The Aga Khan III was so moved by her munificence that in thanking her, he spoke the following words:

Dil'e banda ra zinda kardi,
dil'e Islam ra zinda kardi,
dil'e qaum ra zinda kardi,
Khuda'i ta'ala ba tufail'e Rasul ajarash be dahad"

It means, "You put life in the heart of this servant; you put life in the heart of Islam; you put life in the heart of the nation. May God reward you for the sake of the Prophet!". In sum, Sir Aga Khan collected twenty-six lacs of rupees by July, 1912 in the drive and his personal contribution amounted to one lac rupees.

The Major resolutions and achievement of this period were;

1. AIMEC received a generous donation from ruler of Bhopal, Begum Sultan Jahan and built its head office building at Aligarh. The building is known as "Sultan Jahan Manzil" and even today it holds the office of AIMEC.
2. Movement for Muslim University was primary attention of AIMEC. A National Campaign was in full swing to raise money for Muslim University.
3. Foundation Committee was established under the Chairmanship of Sir Agha Khan.
4. Special attentions were paid to local social and educational issues.
5. Proposal for 1% educational tax to landlords from their agricultural produces.
6. Maharaja Kashmir was requested to pay attention to the educational issues of Kashmiri Muslims. A delegation was sent to Maharaja Kashmir to pursue him to pay attention to the educational issues of Muslims of Kashmir. Arabic Teachers were appointed in Schools of Kashmir
7. Schools at Aligarh will have a Kinder Garden (KG) educational system
8. Urdu should be a medium of Instruction in educational systems in Urdu speaking areas like Punjab.
9. Committee was formed to revise schools curriculum in Bengal
10. State Governments needs to grant some financial assistance to M.A.O. College and Schools.
11. A special fund was established to support the cost of Conferences for teachers and professors.
12. A sub-Committee was formed to help Burma's (Myanmar) educational development.
13. Special scholarship was instituted for meritorious students of Medical and Engineering Colleges.
14. Recommendations were made to have at least one Muslim Members in every state and University Text Book Committee.
15. Efforts were made to start a 'Yateem-Khana" in Burma
16. The need of a Islamia College in every state and secondary school for Muslims in every district was realized and efforts were made to have a Islamia College in every state and a Secondary school for muslims in every district.
17. Efforts were made to bring Islamic Scholars (Ulema) into AIMEC's fold and efforts were made to clear existing confusions from the minds of Ulema.
18. Muslim University Fund Committee was established to raise funds for Muslim University.
19. Muslim students were Encouraged to receive Medical education.
20. A state Educational Conference in Punjab was established.
21. Scholarships were instituted for technical educations for Muslim

students.
22. A Movement was started to promote Madarsah of Calcutta to a Islamia College.
23. Protests were made when University of Calcutta dropped Arabic and Persian from their curriculum.

1917-1947: Nawab Sadar Yar Jang Period:

AIMEC under the umbrella of Aligarh Muslim University

In 1917, Sahabzadah Aftab Ahamd Khan was nominated into the British Council in the Ministry of Indian Affairs and he moved to England. AIMEC elected Maulana Habibur Rahman Khan Sherwani, Nawaba Sadar Yar Jang as its Joint Secretary. In 1920, when M.A.O. College became Aligarh Muslim University, at Amrawati, AIMEC made a constitutional amendment and AMU Vice-Chancellor became President of AIMEC and elected Maulana Habibur Rahman Khan Sherwani, Nawaba Sadar Yar Jang as Honorary Secretary and so he served to position till 1947. In his leadership, the first session was held in 1918 at Surat (Bombay State- now in Gujarat). The session was presided over by Sir Ibrahim Rahmatullah. The session appreciated the efforts of Bombay State Government for starting Urdu Medium Schools. A committee was formed under the leadership of Dr. Ziauddin Ahmad to promote a similar concept of Urdu Medium schools in other states. Fund was raised to establish a Muslim hostel in Surat. Proposal was adopted to start a Training College for the teachers of Arabic Schools/Madaris. The annual session of 1923 at Aligarh adopted the proposal to rename All India Mohammad Educational Conference to All India Muslim Educational Conference.

After the establishment of Aligarh Muslim University, the All India Muslim Educational Conference could not work with the same pace as it worked for the establishment of Aligarh Muslim University. At the same time division of Aligarh Movement leaders and establishment of a news University Jamia Millia Islamia took some of the resources of AIMEC. Even though the sessions of AIMEC used to held annually at Khairpur-Sindh (1919- Maulvi Rahim Bakhsh), Amrawati (1920 – H. Ibrahim Haroon Jaffer), Aligarh (1922- Miyan Fazal Hussain), Aligarh (1923- Sahabzadah Aftab Ahmad Khan), Bombay (1924-Ibrahim Rahmatullah), Aligarh (1925 – Sahabzadah Abdul Qayum), Delhi (1926- Abdul Rahim), Madras (1927 – Shaikh Abdul

Qadir), Ajmer (1928- Sir Shah Sulaiman), Banaras (1930 – Sir Ross Masood), Rohtak (1931 – Sir Syed Raza Ali), Lahore (1932 – Col. Maqbool Hussain Quraishi), Meerut (1934 – Sir Shaikh Abdul Qadir), Agra (1936- Sir Ziauddin Ahmad), Rampur (1936 – H.H. Sir Agha Khan) and the 50th anniversary session of AIMEC was held at Aligarh in 1937. In 1938, the annual session was held in Patna and Maulvi Fazal Haq presided over the session. The next sessions were held at Calcutta (1939–Nawab Kamal Yar Jang), Pune (1940, Maulvi Fazal Haq), Aligarh (1943 – Nawab Zaheer Yar Jang), Jabalpur (1944 – Sir Azizul Haq). The last session of All India Muslim Educational Conference in British India was held at Agra1945 and was presided over by Nawabzadah Liyaqat Ali Khan. These session were focusing on growth of Muslim University and other social and educational issues faced by Muslims of India. During the peak of freedom of India movement, AIMEC sessions were not very regular as the major energy of masses was used in freedom movement.

1947-till date: Post Independence period

On 14th &15th August 1947, British India became 2 independent countries India and Pakistan and due to Aligarh's geographical location, of course All India Muslim Educational Conference became an organization of India. An All Pakistan Educational Conference was formed in Pakistan by Mr. Syed Altaf Ali barelvi. The detail of All Pakistan Muslim Educational Conference can be found in "History of the Conference" by Mr. Syed Altaf Ali Barelvi. The subsequent few years were very tough for the Indian sub-continent and hence even at Aligarh, it took time to bring things in order. Dr. Zakir Hussain was appointed as first Vice-Chancellor of Aligarh Muslim University in independent India. The Ministry of Educational affairs started looking into affairs of Aligarh Muslim University.

Secretary : 1949 - 1992

In the mean time in 1949, AIMEC elected Alhaj Obaidur Rahman Khan Sherwani as its Honorary Secretary. Alhaj Obaidur Rahman Khan was son of Maulana Habibur Rahman Khan Shrwani. This started a new chapter in the history of AIMEC. After his election as Honorary Secretary, the first session was held in 1952 at Aligarh. The session was chaired by AIMEC President and Vice-Chancellor of AMU Aligarh. After the Aligarh session, the last regular session of AIMEC was held in 1955 in Madras (Chennai) under the

leadership of Dr. Zakir Hussain. After 1955 session, no session of AIMEC held. After a gap of 38 years, a session of AIMEC was held in 1993 in Delhi under the Chairmanship of Prof. Rasheeduz Zafar, the then Vice-Chancellor of Jamia Hamdard. This is the last known AIMEC function.

As per Dr. Mohsin Raza, former president of AMU Students Union and a faculty at Jawaharlal Nehru Medical College at AMU Aligarh, a session of AIMEC was also held in 1969 at Aligarh. This session was presided over by Mr. Badruddin Tayyabji, the then Vice-Chancellor of AMU and president of AIMEC. Here is the narration of Dr. Mohsin Raza on 1969 session of AIMEC;

"One session that I attended was held in 1969, Late Badruddin Tayyabji attended this session. Several members assailed the inactivity of the AIMEC ,Maulana Saeedurrehman Zaini was extra loud on which Mr. Badruddin Tayyabji took an exception and got angry". In the same meeting the Sultan Jahan Manzil Hall was officially allotted without rent to the Muslim Social Uplift Society's Medical Coaching Centre."

The official publications of AIMEC do not have any account of this session of 1969.

Till 1972, Vice-Chancellor of Aligarh Muslim University used to be President of AIMEC. In 1972, AIMEC made an amendment in its constitution and elected Industrialist Mr. Mustafa Rasheed Sherwani, Founder & Chairman of Jeep Flashlight. This marked a new start in AIMEC and now AMU doe not have any association with AIMEC. In the meantime Kr. Ammar Ahmad Khan was elected as Honorary Secretary in 1958 and served till 1964, and then Prof. Anwarul Haq Haqqi was Honorary Secretary from 1964 to 1970. Once again Alhaj Obaidur Rahman Khan Sherwani got elected as Honorary Secretary and he served till his last breath in 1992 and then his son Prof. Reyazur Rahman Khan Sherwani got elected as Secretary of AIMEC and Mr. Amanullah Khan Sherwani as Joint Secretary and they are serving till date. AIMEC elected Kr. Ammar Ahmad as its President in 1992 and had served till his last breath in 2004. After his sad demise, no news about any President of AIMEC. As a principal organ of Aligarh Movement, AIMEC found 5 permanent births in AMU Court. Here is the list of MEC representative in AMU Court in the last session; Mr. Asad Yar Khan, New Delhi, Mr. Kh. Mohd. Shahid, New Delhi, Mr.

Munawwar Haziq, New Delhi, Dr. Shahid Qamar Qazi, Aligarh and Prof. Akhtarul Wasey, New Delhi.

All India Muslim Education Conference had played a key role in the establishment of Aligarh Muslim University and had always supported AMU for its progress. Even after 1920, when Aligarh Muslim University was created, AIMEC generated funds to start different courses at AMU and helped in promoting the cause of Aligarh Movement. But for one or the other reasons, AIMEC stopped playing its role in independent India. The geo political situation of Independent India is totally different than British India but this does not prevent to work for the upliftment of social and educational problems of Muslims of India. Different Muslim Social and Educational organizations got started in independent India and flourished in their respective mission like Anjuman Islam and Anjuman Khairul Islam in Maharashtra, Al-Amin in Karnataka and many more in different parts of the country and they had established schools and colleges in their respective area of operation whereas AIMEC became extinct.

To know more about Muslim Education Conference, please refer to;

1. Muslim Educational Conference kay 100 Saal By Amanullah Khan Shrwani
2. Education of Indian Muslims: a study of the All-India Muslim Educational By Akhtarul Wasey, All-India Muslim Educational Conference
3. "Separatism among Indian Muslims" by Francis Robinson, "
4. The All India Muslim educational conference: its contributions By Abdul Rashid Khan
5. The Muslims of British India By Peter Hardy
6. Campaign for Muslim University- David Leylyveld & Gail Minault

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اثرات

سید احمد خان کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو ماضی کے بند خول سے باہر نکالنے اور جدید تعلیم سے بہرہ ور کرنے کی بھرپور جدوجہد کی نتیجتاً وہ معاشی ترقی کے راستے پر گامزن ہو گئے۔ کانفرنس نے ابتدائی بیس (۲۰) سالوں (یعنی اپنے قیام سے ۱۹۰۶ء تک) میں نہ صرف اپنی بنیادیں مضبوط کیں، بل کہ برِعظیم میں مسلمانوں کی تمدنی زندگی کے مختلف تعلیمی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی شعبوں میں دُوررس اثرات مرتب کیے اور اس طرح ہماری ملی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا، جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

تعلیمی اثرات:

یہ کانفرنس سید احمد خان کے تصورِ تعلیم کا نتیجہ تھی۔ آپ کی بے لوث اور مثالی کاوشوں کے ثمرات یُوں مرتب ہوئے:

- کانفرنس نے مسلمانوں کو چار دانگ ہند میں تعلیم کی طرف راغب کیا۔
- قوم کے ہونہار بچوں کے لیے وظائف کا انتظام کیا، قومی تعلیم گاہیں قائم کیں، تعلیمی مصارف کی بہم رسانی کی سبیلیں نکالیں۔
- مسلمانوں کو تعلیمِ نسواں، مدارسِ شبینہ، صنعت وحرفت، اسلامی علوم وفنون، تجارت وزراعت اور دیگر پیشوں کی تعلیم وتربیت جسمانی کی جانب توجہ دلائی۔
- حکومت کو مسلمانوں کے ہر قسم کے جائز تعلیمی حقوق وضروریات کی جانب متوجہ کیا یہاں تک کہ بعض دیسی ریاستوں کے دروازوں پر بھی دستک دی۔
- کانفرنس کی تحریک سے اردو لٹریچر میں معقول اور قابلِ قدر اضافہ ہوا۔
- مسلمانوں کی علم وفن میں دل چسپی بڑھنے سے ان میں حکمت اور دانائی کی اقدار کو راسخ کر دیا۔
- کانفرنس کے خطبات، تقاریر اور قراردادیں آج بھی مسلمانوں کی ترقی کے لیے منارِ نور ہیں۔

معاشی اثرات:

۱۸۵۷ء کے سانحہ نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم اور انگریزی ملازمت سے متنفر کر دیا تھا، لیکن اب صورت حال بدلی:

- سرسید احمد خاں کی تحریکِ علی گڑھ نے جب مسلمانوں کے قلوب وافکار، علم وفن کی روشن خیالی اور وسعت کو اجاگر کیا، تو ان کے لیے ملازمتوں کے حصول کے لیے آسانیاں پیدا ہو گئیں۔
- یہاں کے فارغ التحصیل نوجوانوں نے سرکاری ونیم سرکاری ملازمتوں میں شمولیت اختیار کر کے حتی المقدور مسلمانوں کی ترقی کے سامان پیدا کیے۔ قوم کے یہ سپوت سرسید احمد کے خوابوں کی تعبیر ثابت ہوئے۔
- مسلمانوں نے کانفرنس کی جدوجُہد سے صنعت وحرفت، زراعت، تجارت، وکالت وغیرہ میں کافی ترقی کی۔
- مسلمانوں کی معاشی بدحالی ختم ہونے سے وہ اس قابل ہوئے کہ برِعظیم کی دوسری اقوام خاص کر ہندوؤں کے مدِ مقابل نیا مقام پیدا کر لیا۔

معاشرتی اثرات:

حصولِ تعلیم کے شوق اور مسلمانوں کی معاشی حالت کی بہتری نے اُن کی معاشرتی زندگی میں بھی انقلاب برپا کر دیا:

- منزل اور حصولِ منزل کی جدوجُہد سے اتحاد و یگانگت کا درس ملا۔
- مسلمانوں کی ایک معتدبہ جماعت کو قومی تعصبات کی بیڑی اور ملکی رسم ورواج (جو ان میں ہمسایہ قوم سے تمدنی میل جول کے باعث در آئے تھے) کی غلامی سے بالکل آزاد کر دیا۔
- سرسید احمد خاں کے مشن کو کانفرنس نے ان کی رحلت کے بعد نہ صرف آگے بڑھایا[۱]، بل کہ

---

[۱] ''سرسید احمد خاں کے جانشینوں میں بھی چند ایسے لوگ تھے جن کے دل ودماغ ملی اور ملی جذبے سے سرشار تھے۔ وہ اپنے مقصد کے پیشِ نظر کام کی لگن کا جذبہ بدرجۂ اتم رکھتے تھے۔ پھر نہ وہ رات کو رات سمجھتے تھے اور نہ دن کو دن۔ انھیں لوگوں میں نواب محسن الملک۔ نواب وقار الملک۔ قابلِ ذکر ہیں''۔ (عثمانی، امیر احمد، پروفیسر حکیم۔ مشمولہ مضمون: ''میڈیکل کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور ڈاکٹر ہادی حسن''۔ کراچی، العلم، سہ ماہی جنوری تا مارچ واپریل تا جون ۱۹۸۸ء، جلد نمبر ۳۶ شمارہ نمبر ۱و۲، ص ۸۱)۔

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں انقلاب آفریں کردار ادا کیا۔

سیاسی اثرات:

مسلمانوں میں شعور اجاگر ہونے پر انھوں نے ملت کی بقا و ترقی کے لیے تدابیر بھی سوچیں:

- معاشرے میں بیداری کے باعث مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی بحالی اور حصول کے لیے کوششیں عمل میں آئیں۔
- کانفرنس نے مسلمانوں میں قومی و اجتماعی تعلیم و ترقی کے احساس کو مہمیز لگائی جس سے آگے چل کر ملکی سیاست اور تحریک آزادی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔
- آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی توجہ اور کوشش سے مسلم لیگ معرض وجود میں آئی، جس کے جھنڈے تلے برعظیم کے مسلمان جمع ہوئے اور یوں آزادی کا قافلہ اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہوا۔
- اسی تنظیم نے سرسید احمد کے دو قومی نظریے کو اپنے منشور کی بنیاد بنا کر نہ صرف مسلم قومیت کو اجاگر کیا، بل کہ مسلمانوں کی آزادی کی جنگ لڑی اور تمام تر دشواریوں کے باوجود مسلمانوں نے متحد ہو کر قائد اعظم کی قیادت اور بے مثال رہنمائی میں ۱۹۴۷ء میں مملکت پاکستان حاصل کی۔
- تحریک علی گڑھ[1] سے قیام مسلم لیگ تک کی تاریخ، مسلم تحریک آزادی کا ایک اہم باب ہے، جس پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدارتی خطبات (۱۸۸۶-۱۹۰۶ء) شاہد عادل ہیں۔

[1] ''یوں تو تحریک پاکستان تقریباً ایک صدی سے چل رہی تھی۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا قیام ایک چھوٹے سے پاکستان کا سنگ بنیاد تھا۔'' (زاہدی، سید مسعود۔ مضمون ''قائد اعظم! ہم شرمندہ ہیں!''، ہفت روزہ استقلال، لاہور، ۱۲ تا ۱۸ جنوری ۱۹۸۳ء، ص ۱۹)۔ نیز بقول یاسمین خان، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی جو دہلی سے چند گھنٹوں کی مسافت پر واقع ہے، اسے قیام پاکستان کی نظریاتی جنگ کے مرکزی حیثیت بھی حاصل تھی۔ (عظیم بٹوارا۔ پاکستان اور ہندوستان کا قیام)

- بیسویں صدی کے آغاز میں کانفرنس کی اگلی صف میں شریک مسلم زعما مسلم سیاست میں بھی پیش پیش تھے۔ بقول محترمہ ممتاز معین[1]، یہ کانفرنس مسلم لیگ کے قیام (۱۹۰۶ء) تک ہندوستان میں مسلمانوں کے مفادات کی نگہداشت کرتی رہی۔

الغرض ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام اسی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا توسیعی عمل تھا۔

ظہور الدین خاں امرتسری

[1] مسز ممتاز معین ایم اے، سابقہ پرنسپل اسلامیہ کالج۔ کراچی، مصنفہ دی علی گڑھ موومنٹ۔

پروفیسر سلیمان اشرف اکابرین ملت کی نظر میں

مولانا سلیمان اشرف صاحب کی تقریر، جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے نشر ہوئی۔ بعد میں 'الخطاب' کے عنوان سے ۱۹۱۵ء میں انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپ کر شائع ہوئی۔

مولانا سید سلیمان اشرف کو اللہ تعالیٰ نے جہاں گوناگوں کمالات اور خوبیوں سے نوازا تھا وہاں ان کو تقریر و خطابت کا بھی بڑا ملکہ عطا کیا تھا، ان کی ہر تقریر کی طرح یہ تقریر بھی نہایت موثر، ولولہ انگیز اور از دل خیزد بر دل ریزد کا مصداق تھی۔ دیکھیے مولانا کا یہ خطاب جہاں بہت سی مفید معلومات لیے ہوئے ہے وہیں اسلامی علوم وفنون کی اجمالی تاریخ بھی سامنے آجاتی ہے۔ نیز ان کی تصانیف آج بھی ایک زندہ رہنما کی طرح ہیں۔

ماننا پڑتا ہے کہ مولانا سلیمان اشرف تقریر و تحریر میں 'لمعۃ البیان' کی نعمت عظمیٰ سے سرفراز تھے۔ بقول آل احمد سرور، مولانا کی شخصیت میں علم کی رئیسانہ شان ہے۔ ان کی عظمتوں کے علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، خواجہ حسن نظامی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر[1] ابو اللیث صدیقی اور نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسے اہل علم معترف رہے ہیں۔ ممتاز ادیب اور تذکرہ نگار طالب ہاشمی (۱۹۲۹ء۔ ۱۸؍فروری ۲۰۰۸ء) رقمطراز ہیں۔

''حضرت مولانا سید محمد سلیمان اشرف کا شمار اپنے دور کے سرآمد روزگار علما میں ہوتا تھا۔ وہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اسلامیات کے صدر تھے اور قریب قریب ساری عمر انھوں نے علی گڑھ ہی میں گزار دی۔ ان کا وجود علی گڑھ یونی ورسٹی کے

---

1. ڈاکٹر صاحب مولانا سلیمان اشرف کے درسِ قرآن میں شامل ہو کر ان سے کسب فیض کرتے۔ آپ کی مولانا سے عقیدت و محبت کس درجہ کی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی کوٹھی 'ذکا منزل' کا سنگ بنیاد پروفیسر سلیمان اشرف کے ہاتھوں رکھوایا۔ (زبیری، محمد امین۔ 'ضیائے حیات' ص ۲۶۴۔ طبع دین محمدی پریس کراچی۔ سنہ ندارد)

لیے آیۂ رحمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ علم و فضل کا بحرِ زخار اور ظاہری و باطنی خوبیوں کا پیکرِ جمیل تھے۔ ہزاروں تشنگانِ علم ان کے فیضانِ علمی سے بہرہ یاب ہوئے اور پھر اپنے اپنے دوائر میں ان کے نام کو روشن کیا۔''[1]

علامہ شبیر احمد خاں غوریؔ فرماتے ہیں۔ حضرت مولانا سلیمان اشرف کی ذاتِ گرامی مرجع اکابر و اعیان تھی، ان کی بارگاہ میں نہ صرف یونی ورسٹی کے اکابر بلکہ ضلع علی گڑھ کے روساءِ عالی مقام اور شہر کے عمال و اعیان (امراء و وزراء) حاضر ہوتے تھے۔ بہ قول ڈاکٹر طلحہ رضوی ان کا آبائی نسب حضور غوثِ اعظم رضی عنہ اور مادری نسب حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی رحمہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے۔ سلسلۂ چشتیہ نظامیہ فخریہ سے منسلک تھے۔

مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی اور مولانا عبدالماجد دریابادیؔ لکھتے ہیں کہ مولانا سلیمان اشرف بلاشبہ بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے اور رموز خطابت سے بھی آشنا...... جبکہ بہ قول رشید احمد صدیقی، سید صاحب کو فنِ خطابت[2] میں کمال حاصل تھا:۔

''آواز میں کڑک اور لچک، دھمک تھی...... خطابت پر آتے تو معلوم ہوتا صفیں الٹ دیں گے۔''

خواجہ حسن نظامیؔ نے ۱۹۲۳ء کی 'درویش جنتری' میں سید صاحب کی قادر الکلامی اور شگفتہ بیانی کا ذکر بڑے ہی دل نشیں اور دل کش انداز سے کیا ہے:۔

---

1. ماہنامہ ضیائے حرم۔ لاہور، جنوری ۱۹۸۷ء، ص ۸۱
2. 'عام خلقت کو متاثر کرنے کے لیے فصاحت و بلاغت سے زیادہ کارگر حربہ اور کوئی نہیں۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی تحریکیں ہمیشہ عامۃ الناس کے دلوں میں جگہ کر کے ابھرتی رہی ہیں، جب کسی قوم پر جاہی کی گھٹائیں منڈلا رہی ہوں تو اُس وقت صرف جذبات کی کڑکتی ہوئی بجلی میں ہی یہ طاقت ہوتی ہے کہ ان بادلوں کو چاک کر دے۔ یاد رہے کہ صرف وہی لوگوں دوسروں کو جوش میں لا سکتے ہیں، جن کے اپنے دل سینے میں درد سے تڑپ رہے ہوں۔ کیا وجہ ہے کہ بڑے بڑے لیڈروں کے الفاظ میں لوگوں کے دلوں کو موم کی طرح پگھلا کر جس طرف وہ چاہیں ادھر موڑ لینے کی تاثیر ہوتی ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے اندر جذبات کی بھٹی بھڑکا لینے کی استعداد رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے انقلابات صرف قوت تقریر سے برپا ہوتے ہیں۔' (ہٹلر، ایڈولف۔ 'تزک ہٹلری' (مترجم): چشتی، محمد ابراہیم علی۔ گلشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۸ء۔ ص ۱۶۵)

جامع مسجد یونی ورسٹی

''تقریر ایسی تیز اور مسلسل کرتے ہیں جیسے ای-آئی-آر کی ڈاک گاڑی۔ دورانِ تقریر صرف درود پڑھنے کے لیے تھوڑی تھوڑی دیر میں وقفہ ہوتا ہے، ورنہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمالہ کی چوٹی سے گنگا کی دھارا نکلی ہے، جو ہردوار تک کہیں رُکنے اور ٹھہرنے کا نام نہیں لے گی۔ بیان کی ایسی روانی آج کل ہندوستان کے کسی عالم میں نہیں ہے۔ تقریر میں محض الفاظ ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر فقرے میں دلیل اور علمیت کا انداز ہوتا ہے۔''

جناب سید امیر الدین قدوائی مرحوم تحریر کرتے ہیں:

''حضرت مولانا پروفیسر سید سلیمان اشرف صاحب قبلہ بڑے جید عالم اور مُرتاض درویش تھے۔ وہ اپنی طرف سے تفسیر کا درس مُسلم یونی ورسٹی علی گڈھ کی مسجد میں دیا کرتے تھے۔ اور جو لوگ اس میں شرکت کرتے تھے صرف اُن ہی کو شاگرد تسلیم کرتے تھے، وہ فیض کا دریا تھے۔ جس نے حسبِ ظرف جو کچھ اُن سے حاصل کر لیا اُس کی برکت اُسی نے نہیں بلکہ دُنیا نے بھی دیکھی اور اُس سے نفع پایا۔'' [۱]

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی (۱۹۱۶ء-۱۹۹۵ء) سابق سربراہ شعبۂ اُردو، جامعہ کراچی ''رفت و بود'' کے زیرِ عنوان رقم طراز ہیں:

''مَیں نے بہت سی یونی ورسٹیاں دیکھی ہیں، بڑے بڑے علما کو دیکھا اور قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے، لیکن سلیمان اشرف جیسا عالم مَیں نے نہیں دیکھا۔ مَیں جب اقبال کے مردِ مومن کا تصور کرتا ہوں اور اپنے آس پاس اسے تلاش کرتا ہوں تو مولنا سلیمان اشرف کا پاکیزہ اور روشن چہرہ میرے سامنے آجاتا ہے۔'' [۲]

---

[۱] ماہنامہ ''تاج'' کراچی محمود نمبر، جلد ۱۲، شمارہ ۸، ص ۱۱۲

[۲] روزنامہ جسارت کراچی، ۲۰ر جون ۱۹۸۰ء، ص ۶

مولانا سلیمان اشرف ایک بالغ نظر مصلح

مولانا سلیمان اشرف ایک بالغ نظر مصلح بھی تھے، اس لیے انھوں نے اپنے لیکچرز اور تحریروں کے ذریعہ مسلم معاشرہ میں درآنے والے بگاڑ اور مختلف خرابیوں کی نشاندہی کر کے اصلاحِ احوال کی پوری کوشش کی۔ آیئے اُن کی کچھ تصانیف سے ایسی مساعی کی چند مثالیں دیکھتے ہیں۔

غیر محرم مرد کے ہمراہ حج وعمرہ:

''آج کل یہ مسئلہ بنالیا گیا ہے کہ اگر عورت کسی ایسی عورت کے ساتھ حج کے لیے جائے جس کے ساتھ اُس کا محرم ہو تو سفر جائز ہوگا۔ ہرگز یہ مسئلہ احناف کے نزدیک مقبول نہیں۔ ایسے مفتی جنھیں اپنے مذہب کے لطائف ونفائس کی خبر نہیں، اُن کے فتاوے سے احتراز چاہیے۔ عورت کے ساتھ جب تک شوہر یا محرم قابلِ اطمینان نہ ہو سفر حرام ہے۔ اگر کرے گی حج ہو جائے گا، مگر ہر قدم پر گناہ لکھا جائے گا۔ محرم وہی ہے جس سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ ہمارے ائمہ احناف کی یہی تحقیق ہے اور یہی مسئلہ حق ہے۔'' [۱]

آغاز سفر کے لیے بعض دنوں کا نحس خیال کرنا:

''یہ خیال محض عامیانہ ہے کہ بدھ کا دن منحوس ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ حضرت محبوب الٰہی سیدنا نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کی اس دن کے ساتھ عجیب خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی ولادت چہار شنبہ کو ہوئی، آپ کی بیعت کا دن چہار شنبہ ہے، شیخ نے جس روز خرقۂ خلافت عطا فرمایا وہ چہار شنبہ کا دن تھا، آپ نے جس روز رحلت [۲] فرمائی وہ چہار شنبہ تھا۔'' [۳]

۱۔ محمد سلیمان اشرف، پروفیسر مولانا: الحج، طبع مسلم یونی ورسٹی پریس۔ علی گڑھ، ۱۹۲۸ء، ص ۳

۲۔ یہ کیسا اتفاق ہے کہ مولانا سلیمان اشرف کی وفات بھی چہار شنبہ کے روز ہوئی۔

۳۔ الحج: ص ۳، ۴

کم خوابی و کم خوری:

اطبا متفق ہیں کہ کم کھانا اور کم سونا انسانی صحت کے لیے مفید ہے۔ بسیار خوری اور گھنٹوں لمبی تان کر سونا اگر صحت کے لیے مضر ہے تو نام نہاد ڈائٹنگ سے جسم کو اتنا کمزور کر لینا کہ بیماری کو دعوت دینے کا باعث بنے دونوں انتہا پسندی کا مظہر ہیں۔ اسلام اعتدال کا حکم دیتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''شریعت محمدی نے مسلمانوں کو کم کھانے اور کم سونے کی طرف بہت ہی رغبت دلائی ہے تا کہ قوائے حیوانیہ کا ایسا غلبہ نہ ہونے پائے جو قوائے ایمانیہ کو مغلوب کر لیں''۔ [1]

شرعی لباس کیا ہے؟:

یہ ایک بے نتیجہ اور خواہ مخواہ کی بحث ہے۔ لباس ستر کے لیے ہے اس کا صاف ستھرا اور پاکیزہ ہونا شرط اول ہے۔ مولانا اسلام کی مرضی و منشا بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اسلام نے لباس کے باب میں اس قدر ضرور اصلاح کی ہے کہ متکبرانہ و بے سترو بے حیائی کا جامہ نہ ہو۔ اور یہ ایک کامل مذہب کا فرض تھا۔ باقی کسی خاص تشخص کو لباس میں کچھ بھی دخل نہیں دیا۔ ہاں شارع علیہ السلام کا لباس بے شک مسنون و موجب اجر۔ عبا، جبہ، تہمد و قمیص عربی مسنون و محبوب مگر فرض و واجب نہیں''۔ [2]

مولانا مرحوم کو کیا خبر تھی کہ دین کے علمبردار حضرات مخصوص ٹوپیوں اور عماموں کے ساتھ اپنے گروہ کو دوسروں سے الگ اور نمایاں کرنے کا عجیب و غریب وطیرہ اختیار کریں گے اور رنگ برنگے پہناوے کی بدولت ملت کو ٹکڑیوں میں بانٹنے کا (غیر ارادی طور پر ہی سہی) ناپسندیدہ کارنامہ انجام دیں گے۔

1. محمد سلیمان اشرف، پروفیسر مولانا: الحج طبع مسلم یونی ورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۲۸ء، ص ۲۳
2. سید سلیمان اشرف بہاری، پروفیسر مولانا: البلاغ طبع مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۹۱۴ء، ص ۱۵

مسلمانوں کی سیاست دین سے جدا نہیں:

کم فہمی اور لاعلمی کی بنا پر بعض حضرات اسلام کو زندگی کے تمام شعبوں پر محیط کرنے سے گریزاں ہیں۔ ان کا استدلال ہے کہ اسلام کو صرف عبادات تک ہی محدود رکھا جائے، یہ طرز عمل نہایت ہی خطرناک ہے کہ سیاسی اور معاشرتی معاملات میں لوگوں کی راہ نمائی کرنے کے بجائے انھیں حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر چہ ''دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے دین و دنیا کا ہر پہلو انسانی حیات اور ضروریات کے لیے ایک مکمل ضابطہ پیش کیا، کوئی ایک بھی گوشۂ حیات ایسا نہیں جسے اسلام واضح سے واضح شکل میں پیش نہ کرتا ہو، جہاں وہ روحانی اخلاقی تعلیم دیتا ہے وہیں تمدنی، معاشرتی، تعلیمی، صنعتی، اقتصادی، تجارتی، سیاسی مسائل پر مکمل اصول پیش کرتا ہے، دین و دنیا کو ساتھ لے کر چلتا ہے، وہ دوسرے مذاہب کی طرح رہبانیت نہیں سکھاتا۔'' [1] مولانا سلیمان اشرف نے اپنے رسالہ البلاغ کے حصہ اسلام و خلافت میں اسلام...... اصول تمدن اور اسلام...... اسلام اور سیاست...... اسلام اور حرب...... خلافت...... جیسے عنوان قائم کر کے انسانی ضابطۂ حیات کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اسلام نے ایسی ضروریات زندگی جو انسانی حیات کے لیے جز ولاینفک ہیں مثلاً تمدن، سیاست، حرب۔ اس کو خوب حل فرما دیا۔ اور یہ ایک کامل و صادق مذہب کا فرض تھا۔

مولانا ان عناصر سے بھی مخاطب ہوتے ہیں جو اپنی دعوت و تبلیغ میں اسلام کے قانون، اس کے اجتماعی عدل، معاشی مساوات، معاشرتی اور سیاسی نظام کی بات نہیں کرتے، انھوں نے اپنے اجتماعات اور پروگراموں کو محض چند مذہبی مسائل اور وعظ و نصیحت تک محدود کیا ہوا ہے جبکہ قرآن اور کتب حدیث اور فقہ کی کتابوں میں زندگی کے جملہ پہلوؤں پر جامع ہدایات ملتی ہیں، مگر عبادات اور انسان کے تعلق باللہ کی نسبت مجموعہ ہائے حدیث کا بہت بڑا حصہ اجتماعی اور معاشی مسائل، حقوق انسانی، مملکت کے انتظامی امور اور قیام امن و انصاف کے لیے دیوانی اور فوجداری قوانین

1. فلسفۂ عبادات اسلامی از مولانا محمد عبد الحامد قادری بدایونی، ادارۂ پاکستان شناسی۔ لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۳۲

پر مشتمل ہے۔ مذکورہ رسالہ میں مولانا سلیمان اشرف فرماتے ہیں:

"احکامِ شرعیہ سے جو حضرات کہ ناواقف ہیں۔ اور اُنھیں توفیق اس سے آگاہی کی بھی نہیں ہوتی۔ وہ بر بنائے جہل مرکب[1] یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام صرف تزکیۂ نفس سکھلاتا ہے باقی اُسے دُنیاوی اُمور میں کوئی دخل نہیں۔ اس تیرہ صدی میں جبکہ الحاد و جہل کی گھٹا مسلمانوں پر اُن کی بدنصیبی کی طرح چھائی ہوئی ہو اس طرح کی آوازیں اور بھی اسلام سے بے پروا کرنے والی ہیں۔ لہٰذا یہ بتلا دینا کہ اسلام ہی ہے جس نے تمدن و سیاست و حرب تمام دنیا کو سکھلایا۔ ایک نہایت ضروری بات ہے"۔

چناں چہ خالق کے عطا کردہ کامل نظام...... دین حنیف کو من چاہے خانوں میں بانٹنے کی جاری عمومی روش کو ڈاکٹر محمد ارشد (جامعہ پنجاب) نے اپنے مقالے 'اسلامی ریاست کی تشکیل جدید' میں بے بصیرتی، کوتاہ اندیشی اور خود غرضی سے تعبیر کیا ہے کہ کسی قوم کے اجزائے ترکیبی میں جہاں تہذیبی، ثقافتی، سماجی، مذہبی اور روحانی عوامل بے حد اہمیت کے حامل ہیں، لیکن سیاسی شعور سے عاری انسانوں کا کوئی گروہ دیگر تمام تر خصوصیات کے باوصف ایک قوم کہلانے کا مستحق ہرگز نہیں ہے۔ بقول غلام غوث صمدانی علیگ:

خواہی از سیاست دین جدا ۔۔۔ وای بر تدبیر طبع نارسا
ای ز دین بیگانہ و حق ناشناس ۔۔۔ دینت الحاد و سیاست بے اساس

---

[1] جہل مرکب (ع) مذکر و مونث۔ دُہری نادانی، نادان ہونے پر اپنے آپ کو دانا جاننا، کسی چیز پر خلاف واقع اعتقاد کرنا۔ مثلاً سونے کو چاندی اور چاندی کو سونا جاننا۔ دو جہلوں میں گرفتار ہونا، یعنی عدم علم اور ناواقفیت عدم علم، غلط واقفیت (۲) جو علم نہ ہونے کے باوجود خود کو عالم سمجھے۔

ع آنکس کہ نداند و بداند کہ داند ۔۔۔ در جہل مرکب ابدالدہر بماند

حکیم محمد خلیل احمد القادری الجائسی*

حیاتِ مولانا سلیمان اشرف کی چند جھلکیاں**

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

بلاشک حی و قیوم کے خاص بندے، موت کو اگلے مراتب کے لیے زینہ اور فتح باب بناتے ہیں، بوسیدگی، شکستگی اور بربادی ان کی موت کا دوسرا نام ہے جو محی و ممیت سے کٹ گئے اور فنا کے گھاٹ اتر گئے۔

بقول ڈاکٹر طلحہ رضوی، آپ کا آبائی نسب حضور غوث اعظم رضی عنہ تک اور مادری نسب حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی رحمہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے۔ آپ سلسلۂ چشتیہ نظامیہ فخریہ سے منسلک تھے۔ گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کانپور استاذ الاساتذہ حضرت مولانا احمد حسن رحمہ تعالیٰ کی خدمت میں پہنچ کر کسب علوم دین کی خواہش ظاہر فرمائی۔ استاذِ وقت پہلے حدیث اور پھر منطق کی تعلیم دینا چاہتے تھے، لیکن سید صاحب پہلے منطق اور بعد میں حدیث کی تحصیل پر مصر تھے۔ اپنی رائے پر قائم رہتے ہوئے جون پور حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں رحمہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا رحمہ تعالیٰ نے سیّدزادہ کی ہر خواہش پر سر تسلیم خم کرنے کو خوش نصیبی سمجھتے ہوئے ہر بات بہ طیب خاطر قبول فرمائی اور اس طرح ایک جوہر شناس ماہر کو ایک گوہر بے بہا مل

---

* سابق ریڈر طبیہ کالج۔ علی گڑھ

** مضمون موصولہ ہمراہ گرامی نامہ بنام ظہور الدین خاں از بیت الانور سر سید نگر۔ علی گڑھ مورخہ ۱۱ راگست ۱۹۸۶ء

آدم جی پیر بھائی منزل کا سامنے کا منظر

گیا۔ آپ نے لحہ بہ لحہ اپنی ذہانت وصلاحیت کے خیرہ کن جواہر ریزے بکھیرنا شروع کردیے، اور آخر کار آپ کی جلالت، علم وفضل اور عشق رسول نے آپ کی شخصیت کو ایسا تراشا کہ خود جوہری اپنے گوہر کی آب وتاب سے خیرہ ہو کر اس کا عاشق ہو گیا۔ چناں چہ ایک بار جون پور میں ایک محفل میلاد مقدس میں سیّد صاحب علم وحکمت اور عشق رسول کی فضا کو معنبر ومعطر فرمانے میں محو تھے کہ ایک مرقع علم وحکمت نے منبر پر پہنچ کر وفورِ محبت سے سرشار اور وارفتہ سید صاحب کو سینہ سے چمٹا لیا اور پیشانی کو بوسہ دینے لگے۔ یہ تھے آپ کے استاذ حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں رضی عنہما۔ سیّد صاحب بھی اپنے استاد کے پروانہ تھے۔ آخری سانس تک استاد پر جان نچھاور کرتے رہے اور جب استاذ نے اپنے خالق کے حکم کو لبیک کہا، تو آپ نے ہوش وحواس کھو دیا۔ عرصہ تک کھوئے کھوئے سے رہے۔ آخر کار اسی مدرسہ میں تدریس اور استاد مرحوم کی نیابت کے فرائض کو قبول فرما لیا۔ ایک مناسب موقع پر سیّد صاحب کے عقیدت مند مولوی جواد علی صاحب نے آپ کے علم میں لائے بغیر علی گڑھ کالج کے شعبۂ دینیات کے استاد کی ایک جگہ کے لیے درخواست دے دی۔ پھر انھی کے اصرار پر ۱۹۰۸ء میں آپ بحیثیت استاذ شعبۂ دینیات علی گڑھ تشریف لائے۔

آپ کے حاسدین ومفترین نے آپ کے قیامِ علی گڑھ کے دوران جو جو گل کھلائے اس کا تذکرہ کئی مستند مضامین میں آچکا ہے۔ یہاں بسلسلۂ تقرر ایک واقعہ پیش کر رہا ہوں، جو بورڈ اس جگہ کے استاذ کے انتخاب کے لیے مقرر کیا گیا تھا اس میں ایک اہم رکن نواب مزمل اللہ خان صاحب رئیسِ بھیکم پور بھی تھے۔ تقرر کے لیے غور وخوض اور فیصلہ کے وقت نواب صاحب موجود نہ تھے اور ان کی شخصیت کے پیش نظر ان کی رائے بہر حال قابلِ اعتنا اور ناگزیر تھی۔ نواب صاحب نے حضرت کے تقرر کے لیے یہ شرط پیش کی کہ مولوی حسین احمد صاحب مدنی ان کی قابلیت کی تصدیق کر دیں، جو اتفاقاً علی گڑھ ہی میں موجود تھے۔ نواب صاحب نے شب میں دعوت اور دوسرے دن جلسۂ سیرت پاک کا پروگرام مرتب کیا۔ اب حضرت کی جلالتِ شان، صلابتِ ایمان، کمالِ جرأت واستغنا کی ایک جھلک قارئین ملاحظہ فرمائیں۔ شب کی دعوت میں حضرت مدعو تھے، وہاں پہنچ کر کھانے سے لے کر نشست وبرخاست تک فرقِ مراتب دیکھ کر آپ کی رگ
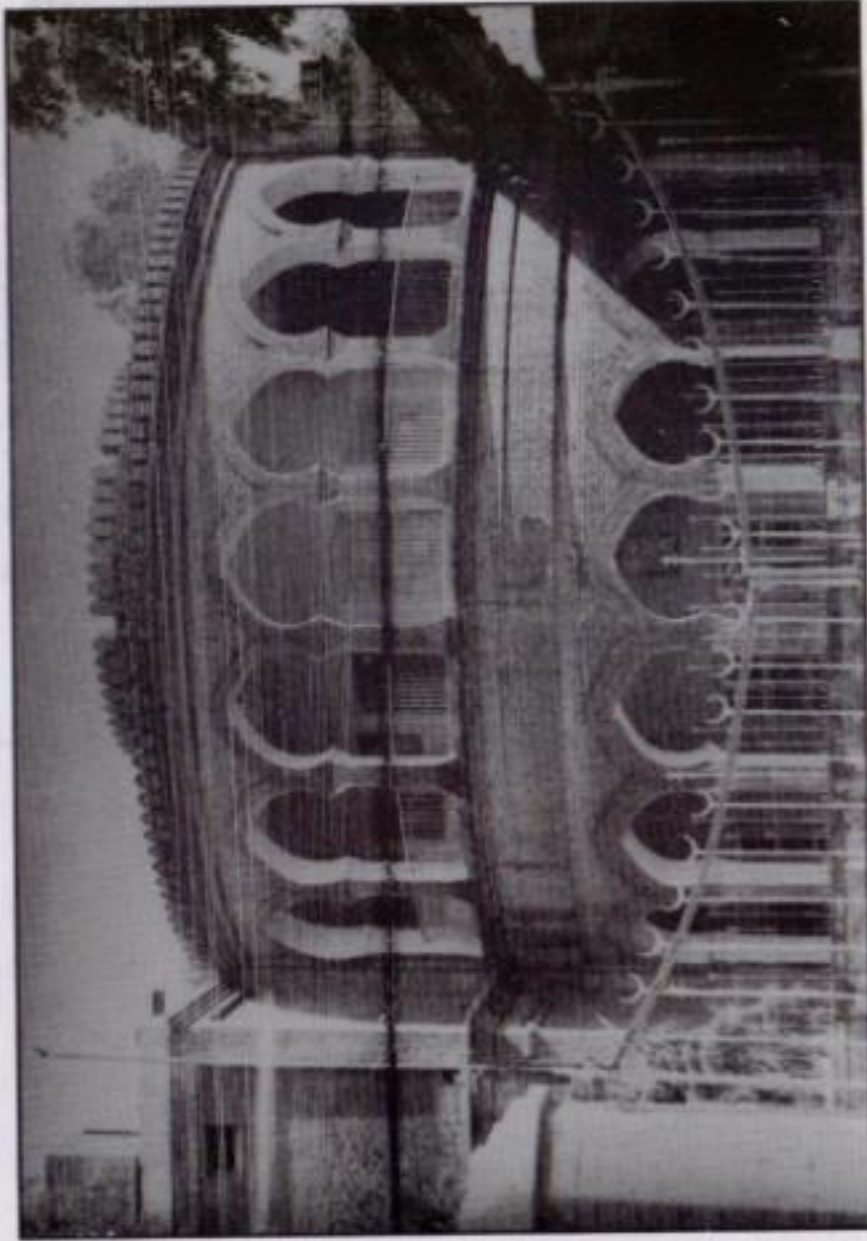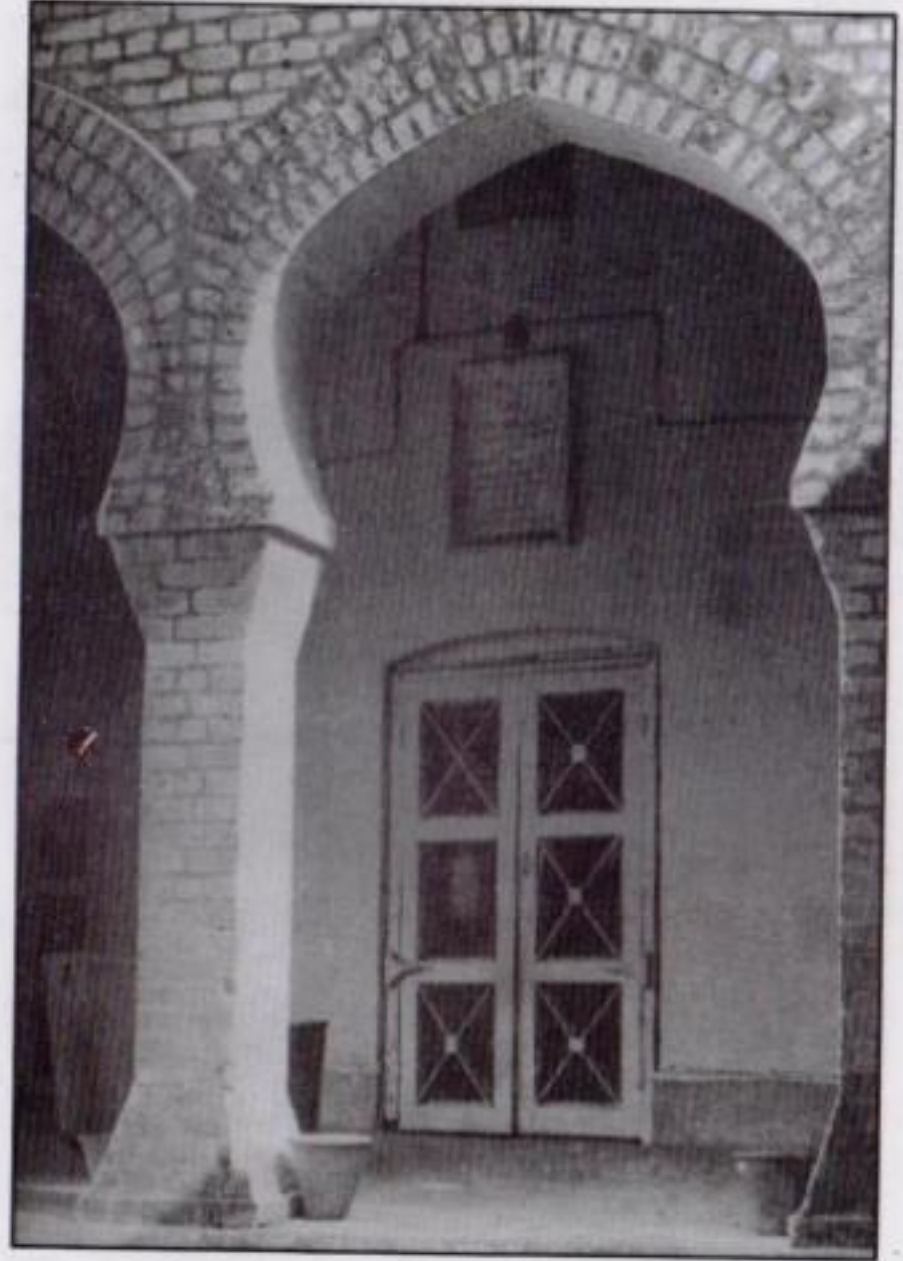
آدم جی پیر بھائی منزل کے اندر یادگار پتھر

ہاشمی بھڑکی اور سخت ناراضگی و ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کھانے میں شرکت کیے بغیر اپنے دوست نواب صدر یار جنگ کے یہاں واپس آ گئے۔ واقعہ سن کر صدر یار جنگ آپ کے تقرر کے سلسلہ میں بے حد متفکر ہوئے، لیکن آپ سراپائے استغنا اپنے معمولات میں مصروف رہے۔ صبح حسبِ پروگرام نواب صاحب کی کوٹھی پر جلسۂ سیرت پاک میں آپ کی تقریر ہوئی۔ آپ کے تبحر، جوشِ بیان اور قوتِ استدلال نے عوام تو عوام خواص کو بھی متحیر کر دیا حتیٰ کہ مولوی حسین احمد صاحب مدنی حضرت کی مدلل تقریر سے مبہوت ہو گئے۔ سید صاحب سے عرض کر دیا گیا تھا کہ مدنی صاحب سلام و قیام کے قائل نہیں ہیں، آپ نے اسی کو اپنا موضوعِ تقریر بنایا اور آیات و احادیث کی ایسی بوچھار کی کہ خود مولانا دورانِ تقریر تصویرِ حیرت و حیران بنے رہے، اور جب سید صاحب صلوٰۃ و سلام کے لیے کھڑے ہوئے، تو مولانا مدنی بھی بے ساختہ اور مودبانہ کھڑے ہو گئے۔ پھر جب سید منبر سے اترے تو مولانا مدنی نے والہانہ انداز میں اُٹھ کر انھیں سینہ سے لگا لیا اور کہا کہ میرا تو خیال تھا کہ مولانا ہدایت اللہ خاں کے یہاں منطق و فلسفہ ہی کا شور و شورہ ہے، آج معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث کے بحرِ زخار کی شناوری میں ان کے شاگرد تک (نہایت) مہارت رکھتے ہیں۔ مولانا مدنی نے یہ تک کہہ دیا کہ اب میں قیام کا قائل ہو گیا۔ نواب صاحب نے اشارہ کیا کہ سید صاحب اس داد پر مولانا کا شکریہ ادا کریں۔ آپ نے برجستہ فرمایا: 'ان دادوں کی کیا حیثیت ہے؟ مجھے داد اُس بارگاہ سے ملتی ہے جو اپنے محب و موالی کی عنایت سے قاسم بھی ہے مختار بھی۔'

آپ کی شخصیت عزتِ نفس، غیرتِ علم، قلندریت اور دانش وری کا مرقع تھی۔ ''آدم جی پیر بھائی منزل'' کے ایک حصہ کو اپنا بسیرا بنا لینے والے اس مردِ مومن اور صوفی باصفا نے زندگی کی وہ طرح ڈالی جس سے ہزاروں زندگیوں نے روشنی لی اور خود بھی منارۂ علم و عمل بنے۔ وائس چانسلر سر ضیاء الدین آپ کے حضور میں حاضری کو باعثِ فخر سمجھتے تھے اور اہم مسائل میں آپ کی اصابتِ رائے سے ہمیشہ استفادہ کرتے رہتے تھے۔ ریاضی کی چند گتھیوں کو سلجھانے کے لیے حضرت ہی کے مشورہ پر انھی کی معیت میں سفرِ جرمنی کو بریلی کی طرف موڑ دیا اور چٹکیوں میں حل ہونے والی گتھیوں کے واقعہ پر بر عظیم کے عظیم ماہرِ ریاضیات ہمیشہ کے لیے نہ صرف حضرت بلکہ امام اہلسنت

مزار مبارک کے متقابل لوحِ منظوم تاریخ وصال

ہی کادم بھرنے لگے۔ پروفیسر ظفر الحسن کے تحقیقی مقالہ کے اصل روح رواں سید صاحب ہی
علم دین کی حرمت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کانووکیشن میں شریک نہیں ہوئے۔
عربی، فارسی اور منطق وفلسفہ کے پروفیسران اپنی گتھیوں کو لے کر طالب علمانہ آتے اور نئی
و نئے عزم کے ساتھ کلاس جاتے۔ گفتگو میں علم وفضل کی جلالت ومتانت کے ساتھ ساتھ
طبعی اور مزاح لطیف کی کلیاں بھی کھلتی رہتیں۔ خود فراموشی اور قلندریت نے اگر ایک جانب
ں اور سادہ مزاجی کا سبق آموز نقشہ پیش کیا، تو دوسری طرف نزاکت طبع نے رؤساءِ وقت کو
ت بدنداں کر دیا۔ گرمی کی آگ، سردی کی برفانیت، برسات کا طوفان باد وباراں ہمیشہ ایک ہی
جگہ پر آپ کے قیام گاہ کی استقامت کو چومتی اور آگے بڑھتی ہیں۔ صدر یار جنگ جو خود بھی متبحر عالم
اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے لوگوں سے مراسلانہ ربط رکھتے ہمیشہ عصر ومغرب کی نماز آپ کے فقیر کدہ
پر آپ کی امامت میں پڑھتے۔ اور گھنٹوں علمی پیاس بجھاتے رہتے۔ سید صاحب کی مرقد انور اور
قیام گاہ کے سنگِ مرمر پر کندہ کتبے سید صاحب کے حضور آپ کی عقیدت بلکہ والہانہ عشق اور کمال علم
وفضل کے آئینہ دار ہیں۔ سید صاحب کی تنہا "المبین" ایک دائرۃ المعارف یا انسائیکلوپیڈیا ہے جو ایک
نئے فن کی ایجاد کا سرچشمہ اور حضرت کے لسانی اور ادبی نابغیت کی زندہ تصویر ہے۔ اگر آپ اسی پر
بس کرتے تو اس سے ہزاروں کتابیں وجود میں آسکتی اور جنم لے سکتی تھیں۔

آپ نے تصنیفی زندگی میں مقدار، حجم اور تعداد کو نہیں بلکہ ضرورت وقت، مسائل کی اہمیت کو
فوقیت دی۔ دینی علمی، سیاسی سماجی وغیرہ موضوعات میں جب بے راہ روی، گم رہی اور اسلام وجمہور
کو نشانہ بنتے دیکھا فوراً آپ کے قلم نے پتھر کی لکیر کھینچ دی اور زبان وبیان، سلاست وفصاحت کے
ساتھ دلائل وبراہین کے وہ انبار لگا دیے کہ مخالف بھی سوچنے اور ماننے پر مجبور ہوا۔ المبین، النور،
البلاغ، الانہار، السبیل، الخطاب، الحج وغیرہ آپ کے اس نظریہ تصنیف کے ترجمان ہیں۔

آپ کے مزار مبارک پر یہ زندہ کرامت دیکھنے میں آئی کہ کھجور کا جو درخت مزار انور پر
سایہ فگن ہے اس کی تمام شاخیں مردہ اور خشک ہو چکی ہیں، لیکن وہ شاخیں تر وتازہ اور شاداب ہیں،

جنھیں خاص مزارانور (یعنی لوحِ مزار یا تعویذِ قبر) پہ سایہ فگنی کا شرف حاصل ہے۔

ذیل میں لوحِ مزار کی منظوم تاریخ وصال اور قیام گاہ کی تحریر کی نقل درج کی جارہی ہے۔

مرقد

مولانا سید سلیمان اشرف بہاری نظامی فخری میر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی

تاریخ رحلت ۵ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ روز چہار شنبہ

سلیمان اشرف بر اہل تقوے
بہ علم و عمل والیِ دین اشرف
چو نفش شنید ایۂ ارجعی را
بہ جنت شد از قربتِ حق مشرف
سنش از دلِ پاک حسرت نوشتہ
بہ جناتِ عدن سلیمان اشرف

۱۳۵۷
۱
۱۳۵۸ھ

از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی
المتخلص بہ حسرت

سید صاحب کا مزار مبارک قبرستان مسلم یونی ورسٹی کے شرقی غربی گوشہ میں قبرستان[1] (جس کو منٹو سرکل بھی کہتے ہیں) کی چہار دیواری کے اندر ایک چھوٹی چہار دیواری میں واقع ہے، جو

[1] "قبرستان کے شمالی حصے میں ایک چار دیواری کے اندر چند قبریں نظر آتی ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں قبر مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم کی ہے۔ مولانا شعبۂ دینیات کے سربراہ تھے اور میلاد خوانی کی محفلوں میں خاص طور پر مدعو کیے جاتے تھے۔ ان کا سال وفات ۱۳۵۸ھ ہے۔ "بہ جنات عدن سلیمان اشرف" سے ۱۳۵۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔ ماہرین فن تاریخ نے ایک عدد کی رعایت دی ہے۔" (محمد اسلم، پروفیسر۔ "سفرنامۂ ہند"، ریاض برادرز۔ لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۴۷) ناشر

مرقد مبارک کا کتبہ

نواب صدر یار جنگ کی خصوصی عقیدت کی نشانی ہے۔ اس چہار دیواری میں نواب فیملی کے علاوہ اور بھی قبریں ہیں جن کی کثرت اگر ایک طرف وفورِ عقیدت وحصولِ فیوض وبرکات کی مظہر ہے تو دوسری طرف زائرین کی حاضری میں سدِ راہ بن گئی ہے۔ نیز قبرستان ایک دوسرے عقیدہ کے فرد کے انتظام میں ہے اس لیے مناسب دیکھ بھال اور حفاظت (یعنی Maintenance) کے نہ ہونے سے مستقبل میں بوسیدگی بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔

حضرت قدس سرہٗ کی قیام گاہ پر سنگِ مرمر پر کندہ حسبِ ذیل تحریر ہے:

۷۸۶

بیادگار

مولنا سیّد سُلیمان اشرف صاحب مرحوم ومغفور

صدر شعبۂ دینیات مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ متوطن بہار شریف (بہار)

جنھوں نے

تیس (۳۰) سال مُسلسل "آدم جی پیر بھائی منزل" کے اس حصّے میں

مستقل قیام فرمایا۔ اپنی حمیتِ دین، فضیلتِ علم، اصابتِ فکر اور

ستودگی سیرت سے اس درسگاہ کو سَر بلند رکھا اور سَر بلند تر ہے

راہ روانِ شوق ازما سالہا آرند یاد

نقشہا انگیخت در راہِ محبت گامِ ما

تاریخ رحلت ۵ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ مطابق ۲۶ اپریل ۱۹۳۹ء (حسرت شروانی)

یادگار پتھر کا واضح عکس

سخن ہائے گفتنی

مولانا سید سلیمان اشرف گزشتہ صدی کے ان علمائے ذی اکرام میں سے ہیں جن کی ذات علم و عمل کی جامع تھی۔ انھیں علوم شرعی کے ساتھ ساتھ شعر و ادب سے بھی طبعی مناسبت تھی۔ فلسفہ و معقولات کے ماہر تھے تو لسانیات پر بھی عبور تھا۔ مولانا سلیمان اشرف تقریباً ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں محلہ میرداد (پٹنہ، بہار) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا حکیم سید عبداللہ اپنے عہد کے فاضل طبیب و عالم تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب مخدوم سیّد اشرف سمنانی کچھوچھوی کے بھانجے سیّد عبدالرزاق جیلانی سے جا ملتا ہے، تاہم اس خانوادے کے اراکین مخدوم سمنانی کی طرف منسوب ہو کر اشرفی کہلاتے ہیں، خود مولانا کے نام کے ساتھ اشرف کا لاحقہ اسی نسبت سے ہے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے اعمام محترم سے حاصل کی۔ مولانا کے چار چچا تھے۔ مولانا عبدالقادر، مولانا عبدالرزاق، مولانا عبدالغنی اور مولانا عبیداللہ۔ چاروں ہی سے مختلف اوقات میں مختلف کتابیں پڑھیں۔ اسی دوران مولوی رمضان علی سے بھی کسب علم کرتے رہے۔ اس کے بعد بہار اسکول میں داخلہ لیا۔ دسویں کلاس تک پہنچے تھے کہ طبیعت دینی تعلیم کی طرف شدت سے مائل ہوئی۔ اسکول کو خیر باد کہا اور مولانا نور محمد اصدقی (خلیفۂ اعظم شاہ قیام اصدق، پیر بگہہ جموانواں) سے عربی و فارسی کی تعلیم لی۔ اسی دوران ان کے دامن عقیدت سے وابستہ ہوئے اور اخذ طریقت کیا۔ اس کے بعد مولانا مولانا حکیم سیّد وحید الحق استھانوی (م: ۱۳۱۵ھ) کے قائم کردہ "مدرسہ اسلامیہ" استھانواں (قیام ۱۳۰۱ھ) میں مولانا سیّد محمد احسن استھانوی بہاری سے اخذ علم کیا۔ یہ مدرسہ بہار میں دیوبندی احناف کا پہلا نمائندہ مدرسہ تھا۔ یہاں یہ دلچسپ امر بھی لائق ذکر ہے کہ

اس مدرسے کے بانی مولانا سید وحید الحق اور اس کے اولین مدرس مولانا سید محمد احسن مشہور اہل حدیث عالم سید نذیر حسین محدث دہلوی (م:۱۳۲۰ھ) کے تلمیذ رشید تھے۔

مدرسہ اسلامیہ" کے بعد مولانا نے اپنی تعلیمی زندگی کا کچھ عرصہ مولانا احمد حسن کان پوری کی درسگاہ اور "دارالعلوم ندوہ" میں بھی بسر کیا۔ اس کے بعد "مدرسہ حنفیہ" جون پور میں مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری سے اخذ علم کیا۔ مولانا ہدایت اللہ منطق ومعقولات میں اپنے زمانے کے امام تھے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کے شاگرد رشید تھے۔ مولانا نے منطق ومعقولات میں اسی خیر آبادی سرچشمۂ علم سے فیض اُٹھایا۔ ان کے اساتذۂ عالی مرتبت کے علاوہ مولانا کے اساتذہ میں ایک قابل ذکر نام مولانا یار محمد بندیالوی (م:۶ر دسمبر ۱۹۴۷ء) کا بھی ہے۔

مولانا سلیمان معقولات کے عالم، لسانیات کے ماہر، فقیہ ومدرس اور ادیب تھے، لیکن طبعاً وہ اوّل تا آخر ایک صوفی تھے۔ ان کے تصوف کی سب سے بڑی خوبی ان کی سلامت روی اور وسیع المشربی تھی۔ یہاں اس غلط العام خیال کی تردید ضروری ہے کہ مولانا سلیمان اشرف، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے تلمیذ وخلیفہ تھے۔ بعض اہل علم نے بربنائے عقیدت مولانا سلیمان اشرف کو فاضل بریلوی کے اجلہ خلفا میں محسوب کیا ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مولانا سلیمان کو فاضل بریلوی سے شدید عقیدت تھی مگر یہ تعلق عقیدت وارادت تلمذ وخلافت کی نسبت کے بغیر تھا۔ خود مولانا بریلوی نے 'ذکر احباب ودعاء احباب' کے عنوان سے اپنے خلفا کے ناموں کو منظوم کیا ہے جس میں اپنے چودہ (۱۴) اکابر خلفا کے نام درج کیے ہیں ان میں مولانا سلیمان کا نام شامل نہیں۔ اسی طرح جب مختلف حضرات نے خود کو مولانا بریلوی کا تلمیذ رشید وخلیفہ ارشد باور کرانا شروع کیا، تو مولانا بریلوی کو ضرورت محسوس ہوئی کہ ان جعلی خلفاؤں سے اظہار برأت کی جائے لہٰذا انھوں نے ضروری اعلان کے تحت ایک اشتہار شائع کرایا جس میں اپنے پچاس (۵۰) خلفا کے نام درج کیے ان میں بھی مولانا سلیمان اشرف کا نام شامل نہیں۔ اگر مولانا سلیمان، فاضل بریلوی کے خلیفہ ہوتے تو کیا ممکن تھا کہ انھیں نظر انداز کر دیا جاتا؟ مولانا نے مسلم یونی ورسٹی

علی گڑھ جیسی مرکزی درسگاہ میں بیٹھ کر سالہا سال درس وتدریس کی ذمہ داریاں نبھائیں مگر ان کے کسی شاگرد نے اور نہ ہی کسی معاصر نے انھیں مولانا بریلوی کی خلافت سے منسوب کیا حتیٰ کہ مولانا سلیمان کے سوانح نگار محمد علی اعظم خاں قادری نے اپنی کتاب "حیات وکارنامے۔ سید سلیمان اشرف بہاری" میں مولانا بریلوی سے ان کی عقیدت کا ذکر تو کیا مگر ان سے نسبت تلمذ وخلافت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔

مولانا سلیمان کی وسیع المشربی نے انھیں ہر طبقے میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ ان کے مراسم اپنے نقطۂ نظر کے مخالف علما واہل علم کے ساتھ بھی بڑے خوشگوار تھے۔ مولانا کا دینی وسیاسی مسلک مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے مسلک کے مطابق تھا۔ اپنے مسلک میں شدت سے وابستگی کے باوجود انھوں نے دوسرے مکاتب فکر کے اہل علم کے ساتھ احترام کا رشتہ کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ان کی تحریر وتقریر میں کبھی سوقیت طاری نہیں ہوئی۔ اسی طرح اپنے نقطۂ نظر کے مخالف علما، اشخاص واداروں کے محاسن کا ذکر کرنے سے مولانا کے قلم نے بخل سے کام نہیں لیا۔ عربی مدارس میں اصلاح اور انگریزی کی شمولیت کا خیال سب سے پہلے مولانا ابو محمد ابراہیم آروی (م:۱۳۱۹ھ) کے دل میں آیا تھا جسے انھوں نے عملی شکل (مدرسہ احمدیہ آرہ) میں مرتسم کیا۔ عام طور پر مورخین اس کا ذکر نہیں کرتے۔ مگر مولانا سلیمان اشرف نے باوجود اختلاف مسلک ومشرب تسلیم کیا کہ:

"اگر خصوصیت ملی اور امتیاز قومی کی حیات تشنۂ آب علوم اسلامیہ تھی تو قوام جسم کا نظام اپنے بقا اور نمو کے لیے انگلش زبان کا بھوکا تھا حکماء امت کی دور بین نگاہوں نے اسے دیکھا اور عربی مدارس کے اصول تعلیم میں تغیر وتبدل کے لیے آمادہ ہو گئے خالص مدارس عربیہ میں کچھ انگریزی کی تعلیم داخل کی گئی نیز طریقۂ تعلیم میں بھی سہولت کی راہ پیدا کی گئی۔ فقیر کے علم میں سب سے پہلے مدرسہ احمدیہ آرہ نے اس کی بنیاد رکھی۔ صرف ونحو کی بعض کتابیں سہل اصول پر تصنیف ہو کر وہاں سے شائع ہوئیں اور کچھ انگریزی کا سیکھنا لازم قرار دیا گیا۔" (السبیل ۲۷)

اسی طرح جب ایک ملحد کی تردید مسئلہ ڈاڑھی پر "نزہۃ المقال فی لحیۃ الرجال" لکھی تو اس میں مولانا ابومحمد ابراہیم آروی، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا ابوعبدالرحمٰن عبداللہ ہزاروی ثم گیلانی وغیرہم کے فتوے بھی درج کیے۔ یہ مولانا سلیمان کی وسعتِ قلبی کی واضح دلیل ہے۔

مولانا مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے لائق تکریم استاد تھے جہاں مختلف الخیال علما و اہل علم موجود رہتے تھے۔ مولانا بھی اس بزم کے ایک رکن تھے۔ مولانا کو ارباب دولت سے کبھی سروکار نہیں رہا۔ اللہ نے انھیں غنائے قلب کی دولت سے نوازا تھا۔ انھوں نے تازیست کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی اور نہ ہی کسی سے اپنے جاہ و مرتبے کی امید باندھی۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"مرحوم خوش اندام، خوش لباس، خوش طبع، نظافت پسند، سادہ مزاج اور بے تکلف تھے، ان کی سب سے بڑی خوبی، ان کی خودداری اور اپنی عزتِ نفس کا احساس تھا، ان کی ساری عمر علی گڑھ میں گزری، جہاں امرا اور ارباب جاہ کا تانتا لگا رہتا تھا مگر انھوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی اور نہ ان میں سے کسی سے دب کر یا جھک کر ملے، جس سے ملے برابری سے ملے اور اپنے عالمانہ وقار کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر علی گڑھ کے سیاسی انقلابات کی آندھیاں بھی ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکیں۔ علی گڑھ کے عشرت خانہ میں ان کی قیام گاہ ایک درویش کی خانقاہ تھی، یہاں جو آتا، جھک کر آتا، اگر مجلس سازگار ہوئی تو دعائیں لے کر گیا ورنہ الٹے پاؤں ایسا واپس آیا کہ پھر اُدھر کا رخ نہ کیا۔" (یادرفتگاں: ۱۸۹-۱۹۰)

مولانا نہایت نیک نفس تھے، دوسروں کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔ اپنے استاد کے داماد کو ملازمت دلوائی۔ اور ان کے بیٹے کے تعلیمی اخراجات کے کفیل ہوئے۔ پڑھا لکھا کر انھیں یونی ورسٹی میں ملازمت کے قابل بنایا لیکن پھر اس کی ضرورتوں کا خیال رکھتے رہے۔ اپنے ایک بھانجے سید معین کی کفالت کی۔ مولانا کے ایک بڑے بھائی سید انیس اشرف جو محکمہ پولیس میں آفیسر تھے ان کا دماغی توازن خراب ہو گیا تھا۔ انھیں اپنے پاس رکھا اور جس جانفشانی سے ان کی

خدمت کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بقول سیّد سلیمان ندوی:

"اپنی ضعیف والدہ کی اطاعت اور اپنے ایک دیوانہ بھائی کی رفاقت اور خدمت میں عمر اس طرح گزاری کہ اس کی نظیر مشکل ہے۔" (حوالۂ مذکور)

مولانا مدت العمر شادی سے گریزاں رہے۔ اپنی والدہ مکرمہ کے شدید اصرار پر آخری عمر میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے مگر کوئی اولاد نہ ہوئی۔

مولانا کے علم و فضل اور ان کے طرز خطابت و وعظ کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ابرار حسین فاروقی لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم و مغفور کے علم و فضل کا اندازہ وہ لوگ خوب کر سکتے ہیں جنھوں نے ممدوح سے درس لیا یا ان کے مواعظ حسنہ سنے۔ ان کا وعظ سیدھے سادے الفاظ میں تصنع، تکلف اور لفاظی کے بغیر بڑا دلکش ہوتا تھا۔" (ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ۔ فروری ۱۹۷۵ء)

مولانا اپنے نقطۂ نظر کے اظہار میں بڑے جری و بیباک تھے۔ کسی مخالفت کی پروا نہ کرتے تھے، جب ہندوؤں کے سیاسی اثر سے مسلمان زعما بھی ذبیحہ گاؤ کو مصلحتاً ترک کر دینے پر آمادہ ہو گئے تو مولانا سید سلیمان اشرف نے اس کی سختی سے تردید کی۔ اپنی گراں قدر کتاب "الرشاد" میں اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی۔ مولانا سلیمان اشرف کے علاوہ بہار کے جن علما نے ذبیحہ گاؤ کی حمایت میں سرگرمی سے حصہ لیا ان میں مولانا حکیم محمد ادریس ڈیانوی اور مولانا محمد شموئیل عظیم آبادی وغیرہم قابل ذکر ہیں۔ موخرالذکر کی کتاب "عیدالمومنین" کے عنوان سے پٹنہ سے طبع ہوئی جس پر اول الذکر کی تقریظ ہے۔

مولانا سلیمان کی زندگی کا ایک قیمتی اور روشن پہلو ملت اسلامیہ کے لیے دل دردمند رکھنے والے غم خوار کا تھا۔ ان کا سینہ امت مسلمہ کی زبوں حالی سے غم زدہ تھا اور ان کی آنکھیں زوالِ امت پر اشکبار تھیں۔ وہ دین اور سیاست کی تفریق کے سخت مخالف تھے۔ خود فرماتے ہیں:

''جو مذہب اپنی حفاظت نہیں کرسکتا اور اپنی مامون زندگی کے لیے طاقت روا نہیں رکھتا ہے اُس کا وجود محالاتِ عادیہ میں سے ہے اور وہ ایک فلسفۂ خیالی سے زائد مرتبہ نہیں رکھتا۔ وہ ہاتھ جس میں اخلاقِ حسنہ کی کتاب ہو نہایت ہی مقدس و واجب التعظیم ہے اُس کو بوسہ دیجیے آنکھوں پر رکھیے۔ لیکن سلامت وہی ہاتھ رہ سکتا ہے جس میں خونچکاں شمشیر کا قبضہ دکھلائی دے۔'' (البلاغ، اسلام وخلافت: ۲-۳)

وہ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کو ناپسند کرتے تھے اور استعمار کے ہاتھوں کھلونا بننے کو انتہائی معیوب سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کی طاقت کو جب ضعف واضمحلال نے آلیا تو استعمار کو دراندازی کا موقع ملا۔

مولانا نے کئی کتابیں تالیف فرمائیں۔ عربی زبان کی اہمیت وافادیت پر ان کی ایک کتاب ''المبین'' ہے جس پر ہندوستانی اکیڈمی نے انھیں ایوارڈ اور پانچ سو روپیہ نقد انعام دیا۔ ''النور''، ''البلاغ''، ''الرشاد''، ''الحج''، ''السبیل'' اور ''نزہۃ المقال فی لحیۃ الرجال'' بھی ان کے تحریری ذخیرے میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ''ہشت بہشت'' پر ان کا فاضلانہ مقدمہ موسوم بہ 'الانہار' فن شاعری میں ان کے درک کا مظہر ہے۔ ''الخطاب'' ان کا لکچر ہے جو کتابی شکل میں شائع ہوا۔ ''مسائل اسلامیہ'' کے عنوان سے ان کے مختلف مواعظ کا ایک مجموعہ ان کے تلمیذ مولوی عبدالباسط نے جمع کیا۔ خیال ہے کہ ان کے لکچر کے اور مجموعے بھی شائع ہوئے ہوں گے، تلاش وجستجو کی جائے تو مزید مل سکتے ہیں۔

مولانا سیّد سلیمان اشرف اپنے عہد کے کثیر الدرس مدرس اور وسیع المشرب عالم تھے۔ انھوں نے پوری زندگی اس شان سے گزاری کہ علما کے وقار کو مجروح نہ ہونے دیا۔ تا آنکہ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ/ ۲۷ راپریل ۱۹۳۹ء میں اس عالم رفیع القدر نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی وفات پر ''علی گڑھ میگزین'' نے اپنی جولائی ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں ان

خیالات کا اظہار کیا:

''یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم میں جوہر قابل اوّل تو پیدا ہی نہیں ہوتے اور اگر شاذ و نادر پیدا بھی ہوتے ہیں تو ان کی ہستی زیادہ پائندہ نہیں ہوتی۔ گزشتہ چند سالوں میں مسلمانوں کو بعض ممتاز ہستیوں کی اچانک موت سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ انھیں میں ایک وہ گوشہ نشین فاضل اجل تھا جس کی ذات سے علی گڑھ میں فیض کا ایک چشمہ جاری تھا۔ الحاج مولانا سید سلیمان اشرف صاحب جو شعبۂ دینیات مسلم یونی ورسٹی کے صدر تھے تھوڑے عرصہ علیل رہ کر رحلت فرما گئے۔ مرحوم مسلسل تیس سال تک تفسیر قرآن کا درس دیتے رہے۔ اس طویل مدت میں مولانا سے جو فیض ان کے شاگردوں نے پایا اسے انھیں کا دل محسوس کرسکتا ہے۔ مرحوم صوفیانہ وضع کے پابند تھے اور علمائے سلف کا صحیح نمونہ۔ انھوں نے دولت، امارت، حکومت اور شوکت سے مرعوب ہو کر کبھی علم کی توہین نہیں کی۔ مولانا کے متعلق یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ بغیر کسی پس وپیش وتردد کے اپنے خیال اور رائے کا ہر موقع پر اظہار کرسکتے تھے۔ لوگوں کو مولانا سے جو جو فیض پہنچے ان کی داستان تو بڑی طویل ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ مولانا کی وفات سے ہم میں جو کمی ہوگئی اس کے پورا ہونے کی مستقبل قریب میں کوئی امید نظر نہیں آتی۔

خداوندا بیا مرز آں شہید امتحانے را''

یہ جو دوانے سے دوچار نظر آتے ہیں ان میں بھی کچھ صاحب اسرار نظر آتے ہیں

ایسے ہی دیوانوں میں ہمارے معاصر دوست جناب ظہور الدین امرتسری کا شمار ہوتا ہے۔ وہ تاریخ برعظیم کا کتابی ذوق رکھتے ہیں۔ کتاب سے محبت ان کی ذاتی علامتوں میں سے پہلی علامت ہے۔ مولانا سلیمان اشرف سے ان کو گہری قلبی وابستگی ہے۔ یہ مولانا سلیمان کی ''روحانی

جلالت'' ہی کہیے کہ اپنے روحانی استاد کی طرح ان کا مسلک بھی صلح کل ہے۔ وہ اپنے مسلک پر سختی سے کاربند رہنے کے باوجود دوسرے مسالک کے اہل علم سے دوستانہ مراسم رکھتے ہیں، جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے۔

ظہور امرتسری صاحب نے اپنے وسیع المشربی کے باوجود اپنے مسلک کی بذریعہ قلم و قرطاس جیسی خدمات انجام دیں وہ قابل قدر ہے۔ مولانا سلیمان اشرف کی کتابوں کی ازسرنو طباعت کر کے انھوں نے مولانا کو ایک نئی علمی زندگی دی ہے۔ اگر یہ کتابیں وہ شائع نہ کرتے تو مولانا سلیمان کا نام تو یقیناً زندہ رہتا مگر ان کے کام سے لوگ واقف نہ ہو پاتے۔

برعظیم میں ان کے مسلک کے نمائندہ علما کی تاریخ وسوانح اور ان کی مساعیٔ حسنہ کی جستجو ظہور امرتسری صاحب کا خاص موضوع ہے۔ اس سلسلے میں ان کی دیوانگی اپنے طبقے کے اہل علم کی فرزانگی پر فضیلت رکھتی ہے۔

بااین ہمہ، ''الخطاب'' کی نقل کے ساتھ یہ چند صفحات میں نے ان کی خواہش پر تحریر کیے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ ان کے نیک جذبات کا بہتر صلہ عطا فرمائے اور وہی بہتر اجر دینے والا ہے۔

والسلام مع الاکرام

محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

۷/ اکتوبر ۲۰۱۳ء

کراچی

آتیناہ الحکمۃ وفصل

الخطاب

تقریر فقیر محمد سلیمان اشرف

بموقع اجلاس بست و ہشتم کانفرنس

منعقدہ راولپنڈی

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ

۱۹۱۵ء